لرزشِ لب

محمد حنیف کاتب

وہ زندگی کی ناہمواریوں اور ناکامیوں کا ذکر بھی کرتے ہیں اور چہرے کی مسکراہٹ کو بھی بیان کرتے ہیں۔ محمد حنیف کاتب کا شمار عصرِ حاضر کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کا اندازِ بیان طنزیہ بھی ہے اور حزنیہ بھی۔ ان کے لب و لہجے میں تلخی بھی ہے اور نرمی بھی۔ وہ اپنے کلام سے پیغام دینے کی نہ تو کوشش کرتے ہیں اور نہ ہی کوئی فیصلے سناتے ہیں۔ شعر کی تہہ داری پر ہمیشہ ان کی گہری نظر رہتی ہے۔ ان کی شاعری کا انسان زخمی ہے جس کا وہ مداوا چاہتے ہیں۔ وقت کے ملبے کی حقیقتوں تک رسائی میں ہی ان کے شب و روز گزرے ہیں۔ یہ کہنا بھی مناسب ہے کہ محمد حنیف کاتب چھوٹی بحروں میں چھوٹے چھوٹے واقعات کو پرو کر انھیں پر تاثیر بنا دیتے ہیں۔ ان کے شعری مجموعہ 'لرزشِ لب' میں معنی کی ایک نئی دنیا آباد ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ اس میں کچھ نئے اظہاری پیرایے ابھر رہے ہیں۔ نیا معنیاتی نظام بھی قائم ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ یہی خوبیاں ہمیں محمد حنیف کاتب کی انفرادیت اور اہمیت کو تسلیم کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق صدف

لرزشِ لب

محمد حنیف کاتب

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

LARZISH-E-LAB

by

Mohamed Haneef Katib

Year of Edition 2017

ISBN 978-93-86486-52-3

Price Rs. 200/-

نامِ کتاب : لرزشِ لب

شاعر : محمد حنیف کاتب

3B, Ponmari Towers, 7, Montieth Lane ,
Egmore, Chennai 600008
Mobile: 9840873716
Email: katib_haneef@hotmail.com

زیرِ اہتمام : تملناڈو اردو رابطہ کمیٹی / کاتب اکادمی، چینئی، بنگلور

سنِ اشاعت : ۲۰۱۷ء

قیمت : ۲۰۰ روپے

مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

ملنے کے پتے:

کوالٹی بک ڈپو، موسوی کومپلکس، ٹرپلیکین، چینئی ۵

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

ڈاکٹر مشتاق صدف

محمد حنیف کاتب کا غزلیہ متن

محمد حنیف کاتب سے میری پہلی ملاقات چینئی میں ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام 27 ستمبر 2015 کو ایک شعری نشست میں ہوئی تھی۔ اسی نشست میں انھیں میں نے پہلی بار سنا۔ ان کے منتخب اشعار اور غزلیں سن کر میں بہت متاثر ہوا۔ بعد میں چائے کے وقت انھوں نے مجھے اپنی شاعری کا ایک مسودہ پیش کیا اور کچھ لکھنے کے لیے درخواست بھی کی۔ چینئی سے جب میں دہلی واپس آیا تو اس کی ورق گردانی کی۔ مسودہ کی ابتدائی غزلوں سے ہی میں ان کا قائل ہوتا چلا گیا۔ ہر غزل میں نئے اشعار، نئے خیالات اور نئے لب و لہجے کا احساس ہوا۔ پھر کیا تھا پورا مسودہ پڑھنے پر مجبور ہو گیا۔ ان کی بعض غزلوں نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ جسم کے اندر احساسات کے تار جھنجھنا اٹھے۔ پھر میں نے ان پر کچھ لکھنے کی ٹھان لی۔ اگر وہ درخواست نہ بھی کرتے تو بھی ان پر میں ضرور لکھتا کیونکہ لکھا اسی پر جاتا ہے جو دلوں کو بے قرار کر دیتا ہے۔ محمد حنیف کاتب کی شاعری اس معیار کی ہے کہ اسے پذیرائی حاصل ہو۔ دراصل وہ شاعری کے ایک ایسے کمہار ہیں جو اپنی چاک پر ہندوستان کی مٹی سے نئے ظروف بناتے ہیں۔ ہندستانی مٹی سے ان کے معاصرین بھی اپنا ہنر دکھاتے ہیں اور محمد حنیف کاتب بھی لیکن ان میں محمد حنیف کاتب کچھ الگ ہی دکھائی دیتے ہیں۔

وہ زندگی کی ناہمواریوں اور ناکامیوں کا ذکر بھی کرتے ہیں اور چہرے کی مسکراہٹ کو بھی بیان کرتے ہیں۔ ان کا اندازِ بیان طنزیہ بھی ہے اور حزنیہ بھی۔ ان کے لب و لہجے میں تلخی بھی ہے

اور نرمی بھی۔ ان کا اعتماد بہت مضبوط ہے۔ خاص بات یہ بھی ہے کہ محمد حنیف کاتب اپنے کلام سے پیغام دینے کی نہ تو کوشش کرتے ہیں اور نہ ہی کوئی فیصلے سناتے ہیں۔ شعر کی تہہ داری پر ہمیشہ ان کی گہری نظر رہتی ہے۔ ان کی شاعری کا انسان زخمی ہے جس کا وہ مداوا چاہتے ہیں۔ وقت کے ملبے کی حقیقتوں تک رسائی میں ہی ان کے شب وروز گزر رہے ہیں۔
یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

میں سورج ہوں مجھے جانا پڑے گا
مری خاطر سنا ہے رات ٹھہری ہے

اب وقت ہے دیواروں پہ تحریر کریں گے
اب راز چھپا کر کوئی رکھنا بھی نہیں ہے

شکست خوردہ قبیلے کا ترجمان ہوں میں
گزشتہ جنگ سے اب تک لہولہان ہوں میں

صدیوں سے اپنا ملبہ ہے یوں ہی پڑا ہوا
بکھرے ہیں ایسے ہم کہ سمیٹے نہیں گئے

ان کی غزلیں طول کلامی سے بھی پاک ہیں۔ وہ دراصل مدھم لہجے کے شاعر ہیں۔ اسی لیے ان کی غزلوں میں جو مدھم آنچ ہے وہ ان کے گہرے جذبات واحساسات کی

تہذیب سے سامنے آتی ہے۔ان کا لہجہ دھیما ضرور ہے لیکن اس میں جرأت مندی بھی ہے۔ یہ کہنا بھی مناسب ہے کہ محمد حنیف کاتب چھوٹی بحروں میں چھوٹے چھوٹے واقعات کو پرو کر انھیں پرتاثیر بنا دیتے ہیں۔ چند اشعار اس حوالے سے بھی خاطر نشان ہوں:

اس کا ہونا بھی نہ ہونے جیسا
کیسا پانا کہ ہے کھونے جیسا

ہر اک منظر دوبارہ دیکھتا ہوں
ادھر کچھ دن سے حیرانی بہت ہے

درمیاں واسطہ بھی نہیں
ہم کہاں آنجناب کہاں

سارے وعدوں سے مکر جانا تھا
دل نے اک روز تو بھر جانا تھا

چاند بھی جاگتا رہتا کب تک
ہم کو بھی لوٹ کے گھر جانا تھا

محمد حنیف کاتب کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری ایک الگ پہچان رکھتی ہے۔ان کے شعری مجموعہ 'لرزشِ لب' میں معنی کی ایک نئی دنیا آباد ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

اس میں کچھ نئے اظہاری پیرایے ابھر رہے ہیں۔ نیا معنیاتی نظام بھی قائم ہوتا ہوا نظر آرہا ہے۔ یہی خوبیاں ہمیں حنیف کاتب کی انفرادیت اور اہمیت کو تسلیم کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

محمد حنیف کاتب کا ڈکشن کوئی نیا نہیں ہے۔ وہ اپنے معاصرین کی طرح ہی عام ڈکشن کا استعمال کرتے ہیں لیکن ان کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ اپنے ڈکشن کو نئے لب و لہجے کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ دراصل ان کے یہاں جو درمندی، دل آویزی اور کشش ہے وہ ہمیں لطف دے جاتی ہے۔ ان کے یہاں سماجی سروکار، تہذیبی وثقافتی آثار اور سماجی و سیاسی احساس کا ایسا اظہار ملتا ہے جو عام اظہارِ بیان سے کچھ الگ ہے۔ یعنی ان کے اظہاری پیرایے میں ایسی ندرت ہے جو ہمیں انھیں پڑھنے پر آمادہ کرتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

اِدھر اُدھر کے تماشوں میں کھو گئے سب لوگ
جلوس ویسے تو نکلا تھا تام جھام کے ساتھ

دیدار کی حسرت میں سب کچھ تو گنوا بیٹھے
اک آنکھ بچی تھی سو حیران اٹھا لائے

اس نے بھی محفلوں میں بلایا نہیں ہمیں
کچھ ہم بھی احتیاط کے مارے نہیں گئے

ان کے غزلیہ متن میں تاریکی، ظلمت اور روشنی کا تلازمہ بھی ایک الگ لطف واثر

رکھتا ہے۔ رات، ظلمت، صبح، چاند، ماہ، ماہتاب اور سورج پر بہت سے اشعار اردو شاعری میں مل جاتے ہیں لیکن آج کا شاعر اگر رات اور صبح کو کوئی نیا معنیاتی اعتبار بخشتا ہے تو نئی بات ہوگی۔ محمد حنیف کاتب رات اور صبح کے معنیاتی نظام کو امیجری کی شکل دے دیتے ہیں جو ہمیں متاثر کرتا ہے۔ درد و غم یا ظلم و جبر کو رات کے استعارہ سے بیان کرنا اور صبح کو انسان کی خوشی اور ترقی سے تعبیر کرنا اور وہ بھی سطحی رجائیت سے اوپر اٹھ کر تو ہم اسے ان کے لہجے کی ندرت تو کہہ ہی سکتے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار:

گہن کی رات کوئی سدِّ راہ تھا شاید
تبھی تو چاند کا چہرہ سیاہ تھا شاید

اک ارتعاش سے سارا طلسم ٹوٹ گیا
وہ پانیوں میں کوئی عکسِ ماہ تھا شاید

سنا ہے اب وہاں ظلمت کا بول بالا ہے
سنا ہے چاند کو بے نور کر دیا گیا ہے

ان کے یہاں جمالیاتی احساس بھی ایک نئے پیراہن میں ڈھل کر سامنے آتا ہے۔ ان کے یہاں جمالیاتی احساس سماجی و سیاسی اظہار سے جڑا ہوا نہیں ہے بلکہ اس میں خالص عشقیہ احساس ہے۔ البتہ کہیں کہیں امیجری کی شکل میں بھی ڈھل کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ جیسے حسن تکلم اور طرز ادا لطیف تبسم میں پوشیدہ ہے۔ اسے ہم حسن کارانہ امیجری کا نام دے

سکتے ہیں۔ یہ ان کی خالص پہچان تو نہیں لیکن آیت اور دھڑکن جیسے الفاظ سے ان کی جمالیاتی کیفیت کا اظہار ضرور ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی عشق میں وعدہ کر کے مکر جانے سے جو جمالیاتی تصویر ابھرتی ہے وہ نفی کی منتہا ہے۔ دراصل جمالیاتی فضا میں ہی شاعر کے تخلیقی محرکات سانس لیتے ہیں۔ یہ اشعار دیکھئے:

ہم پہ روشن وہ آیتوں کی طرح
ہم اسے حرف حرف پڑھتے ہیں

بہت مشکل ہے وعدوں کا نبھانا
مکر جانے میں آسانی بہت ہے

تمام حسنِ تکلم تمام طرزِ ادا
اس اک لطیف تبسم کے خدوخال میں ہے

دھڑکنیں تیز ہوئی جاتی ہیں
کوئی لگتا ہے کہ آیا ہوا ہے

محمد حنیف کاتب کی غزلوں میں تخاطب اور مکالمے کی ساختی کیفیت کا رنگ بھی مختلف ہے۔ اردو کے بہت سے شعرا کے یہاں تخاطب کا منفرد انداز دیکھنے کو ملتا ہے۔ اور یہ ہونا بھی چاہیے کیونکہ مکالماتی لہجے کی تفہیم سے شاعروں کے انداز فکر کا پتہ چلتا ہے۔ اقبال کے یہاں تو مکالماتی کیفیت کا عنصر بہت غالب ہے۔ ان کی نظموں کے ساتھ غزلوں میں

بھی مکالماتی افعال کی تکرار خوب دکھائی دیتی ہے۔ محمد حنیف کاتب کا وصف خاص یہ ہے کہ ان کے مکالمے کی ساختی فضا سے تفہیم کا ایک نیا در کھلتا ہے۔ یہ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

خدا کرے کہ تمہارا یقین بن جاؤں
ابھی ہوں وہم کی صورت ابھی گمان ہوں میں

میں لفظ لفظ ہوں قرطاسِ وقت پر لکھا
مجھے پڑھو کہ تمہاری ہی داستان میں ہوں

اے ہوا اس کی گلی تک لے جا
تیرے دامن سے لپٹ جائیں گے

مقابل عکس کے دیکھو کوئی تصویر بھی ہوگی
جہاں پر خواب رکھے تھے وہیں تعبیر بھی ہوگی

دراصل محمد حنیف کاتب کے یہاں مکالماتی منطقوں کی وسعت میں عشق بھی ہے سماجی سروکار بھی اور فطرت کی عکاسی بھی۔ گویا حیات و کائنات کے اسرار و رموز کے جہانِ معنی کی ایک منفرد رنگ موجود ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ شاعر نے اندازِ تخاطب اختیار کرتے ہوئے بھی عام فہم توضیح کی حد کو پار ہونے نہیں دیا ہے۔ بلکہ مکالماتی رجحان سے حنیف کاتب کی شاعری روشن نظر آتی ہے۔

محمد حنیف کاتب کے موضوعات بھی وہی ہیں جو ان کے معاصر شعراء کے ہیں۔

عشق اور جذبے کے مختلف رنگ، زندگی کی رعنائیاں و محرومیاں، امید و بیم کے سائے، رنج و غم کی تصویریں، خوشیوں کی تعبیریں، یہ تمام رنگ ان کے یہاں خوب دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ ان رنگوں کو اپنے نئے نئے تجربات کی خوشبو سے بھر دیتے ہیں۔ ان کے یہاں عالم بے خوابی بھی ہے اور آنکھوں میں محبت کی فراوانی کے ساتھ ویرانی بھی۔ دشت اور تلاش حق کا سفر بھی اور خموش تبسم بھی۔ نئے نظاروں کو فروزاں کرنے کا عزم بھی اور کڑی دھوپ میں پرچھائیں کی تمنا بھی۔ زندگی کے یہ رنگ دیکھئے:

اک عجب عالمِ بے خوابی ہے
جاگنے جیسا نہ سونے جیسا

ان آنکھوں میں ابھی پانی بہت ہے
محبت کی فراوانی بہت ہے

کسی گل پوش منظر میں سما جا
تری آنکھوں میں ویرانی بہت ہے

سفر ہے دشت کا، تم بھی ذرا سی لے جانا
چھپا کے چھاؤں تہِ سائبان رکھی ہے

قدم قدم پہ ہویدا تری تجلی ہو
نظر نظر میں فروزاں نئے نظارے کر

تلاشِ حق کا سفر اور کچھ طویل تو ہو
یقیں کی راہ میں تھوڑا گمان رکھ دینا

میں کڑی دھوپ میں بیٹھا ہوں، کوئی پرچھائیں
کسی دیوار، کسی در سے نکل کر آئے

محمد حنیف کاتب کی شاعری دراصل زندگی کے تلخ حقائق کے اظہار کی شاعری ہے۔ ان کی فکر و دانش میں بڑی سنجیدگی اور متانت کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ پاکیزہ عشق کے اظہار سے بھی ان کی شاعری بھری پڑی ہے۔ ان کے یہاں درد و غم اور خوشی و انبساط کے اظہار میں ضبط کا عنصر غالب ہے۔ انھوں نے کسی نظریے کے حصار میں کبھی شاعری نہیں کی۔ وہ روایت کی پاسداری بھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے قدردان بھی ہیں۔ نیز اقدار کو بحال رکھنے کے جذبے سے بھی سرشار دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی زبان تہہ دار ہے اور طریقۂ اظہار منفرد۔ یہی وہ ساختیے ہیں جن سے محمد حنیف کاتب کی شاعری عبارت ہے۔ خدا کرے ان کا منفرد تخلیقی جوہر یوں ہی پروان چڑھتا رہے۔

ڈاکٹر راہی فدائی

'لرزشِ لب' - ایک جائزہ

لفظِ 'کاتب' تین چار دہائیوں پیشتر معتبر و محترم لقب تصور کیا جاتا تھا۔ یہ اسلئے کہ کتابی دنیا کی شان و شوکت اور رونق و بہجت کی کلید کاتبوں ہی کے ہاتھوں میں تھی اور اکثر علمی و ادبی سرگرمیوں کا مبدأ و منبع حضراتِ کاتبین کا کمال ہوتا تھا۔ ہر ذی شعور و ذی علم شخص کو ''کاتب'' کا لفظ ''کاتبِ تقدیر'' کی یاد دلانے کے لئے کافی تھا۔ آج بھی اسلام کے اولین کاتبوں کا ذکر آجائے تو کاتبینِ وحی کے نامِ نامی و اسمِ گرامی بڑے ہی ادب و احترام سے لئے جاتے ہیں۔ حضراتِ محدثین و فقہاء کے زمانے میں ''کاتب'' سے مراد عالم و فاضل و ماہر و کامل شخص سمجھا جاتا تھا مگر آج معاملہ اس کے برعکس ہے تاہم فنِ کتابت کی لاج کمپیوٹر مشین اور اس پر چلنے والی انگلیوں نے رکھ لی ہے۔

شمالی آرکاٹ کی مردم خیز سرزمین 'وانمباڑی' میں ایک صاحبِ نسبت، عالمِ دین صوفیٔ صافی بزرگ مولانا پیر جی غلام قادرؒ کا ورودِ مسعود جعفر آباد کے علاقے میں ہوا۔ بقول خطیب اشفاق الرحمٰن مظہر (متوفی ۲۰۱۵ء) ''پیر جی کا نسبی سلسلہ آٹھویں پشت میں حضرت سید شاہ بغدادیؒ سے ملتا ہے جو عین عالمِ شباب میں بغداد سے ہجرت کر کے دہلی وارد ہوئے اور جن کا سلسلۂ بیعت و ارشاد حضرت عبد القادر جیلانیؒ تک پہنچتا ہے۔'' (اکبر زاہد، نقوشِ اسلاف، احمد پبلشنگ کمپنی، وانمباڑی، مطبوعہ ۲۰۱۳ء، صفحہ ۶۹) حضرت پیر جی غلام قادرؒ کی پانچ نرینہ اولاد میں سب سے چھوٹے مولانا پیر جی محمد ابراہیم بحیثیتِ کاتب وانمباڑی ہی میں

نہیں بلکہ شمالی آرکاٹ کے دور دراز علاقوں میں بھی کافی مشہور و معروف تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ کے بعد آپکی اولاد و احفاد میں یہی شہرتِ کتابت بطورِ لقب رائج ہوگئی۔ مولانا کاتب موصوف نے ایک طویل مدت تک شہر کی عظیم دینی درسگاہ مدرسۂ معدن العلوم (قائم شدہ ۱۸۸۰ء) کی نظامت و اہتمام کی ذمہ داریاں بحسن وخوبی سنبھالیں۔ آپ کا وصال ۱۹۵۱ء میں ہوا جبکہ آپ کی عمر بہتر (۷۲) سال تھی۔

مولانا پیر جی کاتب محمد ابراہیمؒ کے پانچ فرزندوں میں جناب کاتب محمد حنیف اپنے ہنر کے اعتبار سے وانمباڑی کے اولین لیدر ٹیکنولوجسٹ ہیں جنھوں نے ایک طویل عرصہ 'کویت' میں گذارا ہے۔ شہرِ وانمباڑی کے علمی وادبی ماحول کی وجہ سے کاتب کا میلانِ طبع شاعری کی طرف رہا ہے۔ اسی لئے جب استاذِ سخن جناب ساحل رشید نے ایک شعری وادبی انجمن "بزمِ نو" کی طرح ڈالی تو کاتب بھی اس سے وابستہ ہوگئے اور پوری فعالیت کے ساتھ اس کی ذمہ داریاں نباہنے لگے۔ پھر کچھ عرصے کے تعطل کے بعد انھیں بیرونِ ملک قیام کرنے کی ضرورت پیش آئی تو یہی شاعری کا ذوق وشوق عود کر آیا اور وہاں باقاعدہ طبع آزمائی کا زرین موقع فراہم ہوتا رہا۔ چونکہ ہر دور میں چاہے وہ طالب علمی کا ہو، یا کاروبار یا ملازمت کا ان کا عزیز ترین مشغلہ مطالعۂ کتب تھا، بالخصوص شعری مجموعے اور معیاری ادبی رسائل کے وہ دلدادہ تھے اسلئے شعر وسخن کا عمدہ شوق اور معیاری ذوق ان کے دل ودماغ میں جاگزیں ہوگیا جس کے نتیجے میں مجموعۂ کلام "لرزشِ لب" کی تخلیق ممکن ہوسکی۔

مہاجرین شعراء وادبا اور بیرونِ ملک بالخصوص خلیجی ممالک میں بغرضِ ملازمت قیام پذیر اہلِ قلم کا المیہ یہ ہے کہ وہ ہجرت کی شدید دشواریوں اور اپنی تنہائیوں کا راگ الاپنا کسی طور بھولتے

ہی نہیں، نثر ہو کہ نظم ہر جا طبعی وحشت اور مقامی اجنبیت کا احساس قارئین اور سامعین کی نذر کرتے رہتے ہیں۔ یہ ان کی مجبوری بھی ہے اور حالات کا تقاضہ بھی۔ اسی لئے اکثر و بیشتر نئی بستیوں کے قلمکاروں کی تخلیقات میں بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے، جس کی وجہ سے ان کے فن پاروں میں کسی جدت و تنوع اور حدت و ترفع کی تلاش صحرا میں امیدِ آبجو کی جستجو کی مماثل ہے مگر حیرت ہے کہ جناب محمد حنیف کاتب کا شعری مجموعہ "لرزشِ لب" اس حساسِ بیچارگی اور احساسِ بے راہروی سے یکسر پاک ہے۔ کہیں دو چار مقامات پر لفظ صحرا کا ذکر آ بھی گیا تو وہ بھی جدت تراشی کے ضمن میں دلکشی لئے ہوئے ہے جیسے یہ شعر:

اونٹ کو کھوجنے نکلیں تو قبیلہ نکلے ‏ اب کے صحرا میں کوئی معجزہ ایسا ہو جائے

ہجرتوں کے عذاب سہتے ہیں ‏ ارضِ موعود کی تلاش میں ہم

جسم کیا روح تک گرد آلود ہے ‏ اب کے صحرا ہواؤں میں موجود ہے

جناب کاتب نے روایت اور جدت کا بہترین امتزاج اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ اس طرح کا خیال بلکہ اس طرح کے دعوے بہت سے نقادوں نے مختلف شعراء کے مجموعوں پر مقدمے لکھتے ہوئے پیش کئے ہیں مگر انھوں نے جدت کی شدت بلکہ اس کی حدت کا ذکر کرتے ہوئے پامال موضوعات ہی کا سہارا لیا ہے۔ راقم الحروف (راہی فدائی) کی رائے میں کاتب موصوف کے یہاں جس قسم کی جدت طرازی پائی جاتی ہے اس میں احساس کی نرم اور دھیمی آنچ کے عمق میں جن تجربات کے ایندھن کی کارفرمائی ہے اسمیں فنکارانہ شائستگی اور شاعرانہ پختگی کا عمل دخل صاف محسوس ہوتا ہے۔ ان کی شاعری کی اس خصوصیت کا ادراک

اس وقت دوبالا ہوتا ہے جبکہ اس کی خواندگی یکبارگی نہ ہو بلکہ شعر کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا جائے۔ مذکورہ جدت کے ضمن میں درجِ ذیل شعر ملاحظہ فرمائیں۔

ایک چھت سر پہ آسماں کی طرح ایک سایہ کبھی سحاب صفت
مطمئن تھے درونِ شہر پناہ ہم سپاہی تو رن کے تھے ہی نہیں
سب نوشتے تو ہم نے دیکھ لئے وہ حوالے متن کے تھے ہی نہیں
ہائے وہ ربطِ باہمی کی فضا فاصلے ما و من کے تھے ہی نہیں
ہم پہ روشن وہ آیتوں کی طرح ہم اسے حرف حرف پڑھتے ہیں
ہر اک منظر دوبارا دیکھتا ہوں ادھر کچھ دن سے حیرانی بہت ہے
سحر تلک تو پگھلنے کی ٹھان رکھی ہے دئے کی لو پہ ابھی ہم نے جان رکھی ہے
احد احد کی صدائیں سنائی دیتی ہیں کسی کی پیٹھ پہ جلتی چٹان رکھی ہے
کسی بھی شاخ پہ یہ بیٹھنے نہیں دیتی مرے پروں میں یہ کیسی اڑان رکھی ہے
ہمارے حق میں بھی اے آسماں اشارے کر ہمارے نام سے روشن ترے ستارے کر
اس کی آنکھوں میں چمک تھی کیا تھی سیپ میں کوئی گہر تھا، کیا تھا
کیا تمازت تھی اس کے لہجے میں برف موسم کی بات کرتا تھا
ہمیں پتہ ہے کہاں پانیوں کے سوتے ہیں کہ ہم نے خاک. بہت دشت دشت چھانی ہے
تمہارے حکم کی تعمیل کرنے آؤں گا میں اپنے آپ کی تکمیل کرنے آؤں گا
آنکھ سے آسمان تک دیکھو کیسا پھیلا ہے جال پانی کا

عنکبوتی ہیں سبھی راہ میں بیٹھے سائے
دیکھنا کوئی گرفتار نہ کرنے پائے

اے گوہرِ مراد! تری جستجو میں تھا
میں ڈوبتا ابھرتا کسی آبجو میں تھا

کل رات میرے ساتھ تھا کوئی ستارہ زاد
اک رنگ آسمان کا چھایا لہو میں تھا

آتش فشاں سا پھوٹ پڑا لمسِ تیغ پر
کیا جانئے کہاں کا تلاطم لہو میں تھا

تم نے بھی کر دیا کیوں ترکِ محاذ
تم تو دشمن کے مقابل بھی نہ تھے

اک روز پلٹنے کا امکان اٹھا لائے
سب کچھ تو وہیں چھوڑا بس جان اٹھا لائے

دیدار کی حسرت میں سب کچھ تو گنوا بیٹھے
اک آنکھ بچی تھی سو حیران اٹھا لائے

حصہ مرے مکان کا مجھ کو بھی چاہئے
اک گوشہ آسمان کا مجھ کو بھی چاہئے

جنابِ کاتب نے حمدیہ اور نعتیہ اشعار میں بھی یہی طریقہ روا رکھا ہے۔ یہ چند شعر دیکھیں۔

تو مری آنکھ میں بھرتا جائے
میں تجھے دیکھ کے بہتا جاؤں

ترے در تک نہ پہنچ پایا تو کیا
ترے رستے میں بکھرتا جاؤں

پہلے پلکیں بچھاؤں گا میں
پھر میں رکھ دونگا قدموں میں جاں

درِ حبیبؐ پہ ہر دم ہے خوشبوؤں کا ہجوم
ہوائیں بانٹتی پھرتی ہیں نکہتیں جیسے

حاصلِ کلام یہ کہ جنابِ کاتب کا یہ مجموعہ نہ صرف نوع بہ نوع موضوعات کا حامل ہے بلکہ طرزِ ادا کے اعتبار سے بھی قابلِ ستائش ہے۔ راقم کو امید ہے کہ اس گرانقدر مجموعہ کی اہلِ ذوق کے درمیان کماحقہ پذیرائی ہوگی۔

ایسا تھا عالمِ وارفتگی حنیفؔ
اک رنگ نقش سے باہر چھلک گیا

خلوتِ جاں میں ڈولتا ہے کون
میرے دل کو ٹٹولتا ہے کون
گونج کس کی ہے گنبدِ جاں میں
میری سانسوں میں بولتا ہے کون

ہر مکاں سے میں نکالا جاؤں
اور ترے شہر بسایا جاؤں

تو مری آنکھ میں بھرتا جائے
میں تجھے دیکھ کے بہتا جاؤں

شوقِ دیدار کا مارا ہوں میں
تو بلائے تو ابھی آجاؤں

پہلے پہنچوں ترے دربار تلک
پھر وہاں سے میں مدینہ جاؤں

تو مرے سامنے ایسے آئے
فرطِ حیرت سے میں پتھرا جاؤں

تیرے ہی بول مرے ہونٹوں پر
گنگناتا رہوں، گاتا جاؤں

وجد میں آؤں کبھی، رقص کروں
چاہے دیوانہ ہی سمجھا جاؤں

تیرے در تک نہ پہنچ پایا تو کیا
تیرے رستے میں بکھرتا جاؤں

داستاں میری کبھی ختم نہ ہو
تو سنے اور میں کہتا جاؤں

مدینہ

میں ترے گلیوں کی خاک ہو جاؤں

ان عرش قدموں کو چوما تھا

میں ترے صدقے

میں تیری خاک میں مل جاؤں، پاک ہو جاؤں

مدینہ، میں تری گلیوں کی خاک ہو جاؤں

وہ ذات جن کا وجود رحمت
غیاب رحمت، شہود رحمت

جمال رنگوں کی بارشیں ہیں
سپید و سبز و کبود رحمت

احد کہ طائف، گواہ باشد
ز فرق تا پا نمود رحمت

زوال شب کی فراز ساعت
نواحِ جاں میں نمود رحمت

فداہ امی، ابی فداہ
میں بھیجتا ہوں درود رحمت

گھر کے، منبر کے ہے درمیاں

روضة من رياض الجنان

میرے ماتھے ابھر آئے ہیں
آپ کی جالیوں کے نشاں

آپ کی رہگزر وہ بھی تھا
وہ کہ تھا ساتواں آسماں

آپ کے نام لیواؤں میں
ایک میں، اک مرا خانداں

آپ کے سامنے کچھ کہوں
کاٹ لوں نہ میں اپنی زباں

پہلے پلکیں بچھاؤں گا میں
پھر میں رکھ دونگا قدموں میں جاں

روزوشب آپ کی شان میں
ساری خلقت ہے رطب اللساں

بادبانوں پہ ہواؤں نے ہدایت لکھی
دور افتادہ زمینوں کی زیارت لکھی

چاند نے نقرئی پیغام اتارا ہوگا
موج در موج چمکتی ہے عبارت لکھی

آج بھی حرف چمکتے ہیں، دعا دیتے ہیں
کن سخی ہاتھوں نے ہوگی یہ عبارت لکھی

لاکھ حالات نے تحریر مٹائی ہوگی
دیکھنا اب بھی جبیں پر ہے عبادت لکھی

اس کی دہلیز تلک مجھ کو رسائی بخشی
میرے مالک نے میرے حق یہ سعادت لکھی

ڈھونڈتا رہتا ہوں دن رات میں تحریروں میں
کوئی مل جائے مرے نام بشارت لکھی

اجنبی شہر سہی، کوئی تو اپنا نکلے
کوئی غمخوار ملے، کوئی شنا سا نکلے

کب تلک بھول بھلیوں میں مقید رہنا
شہرِ جاناں کی طرف کوئی تو رستہ نکلے

اب کے یوں ہو کہ ہر اک رت ہو گلابوں والی
اب کہ ایسا ہو کہ ہر رنگ سنہرا نکلے

اب کے صحرا میں کوئی معجزہ ایسا ہو جائے
اونٹ کو کھوجنے نکلیں تو قبیلہ نکلے

ریگ زاروں میں کنواں کھود رہا ہوں کب سے
ربِ قارون! کسی روز خزانہ نکلے

اب کے صحرا ہواؤں میں موجود ہے
جسم کیا روح تک گرد آلود ہے

آہنی چادریں وہ بھی سیسہ چڑھی
اس سے آگے کی رہ اب بھی مسدود ہے

اک ذرا اس طرف بھی نگاہِ کرم
تیرے در پر کوئی کب سے مسجود ہے

اس سے بہتر نہیں کوئی جائے پناہ
رات ہے، آگ ہے اور رواں رود ہے

گوشوارہ میں تبدیلی کردی گئی
تب زیاں تھا ابھی سود ہی سود ہے

ہر طرف روشنی کی ضمانت نہیں
روشنی دائرے تک ہی محدود ہے

بادلوں جیسا، سیم آب صفت
کیسا پیکر ہے اس کا خواب صفت
گھٹتا بڑھتا ہوں ماہتاب صفت
کوئی شئے مجھ میں ہے خراب صفت

ایک چھت سر پہ آسماں کی طرح
ایک سایہ کبھی سحاب صفت

وہ ہمیں پڑھ کے کب کا بھول گیا
ہم کھلے رہ گئے کتاب صفت

میری پرواز عارضی ہی سہی
ظلمتوں میں رہوں شہاب صفت

کیوں کریدو گے میری مٹی کو
راکھ میں کیا ہے التہاب صفت

کاش ایسا ہو، کوئی دن ابھرو
مطلعِ جاں پہ آفتاب صفت

سلسلے فکر و فن کے تھے ہی نہیں
ہم تو اس انجمن کے تھے ہی نہیں

کون اپنا ہی گھر اجاڑتا ہے؟
باغباں وہ چمن کے تھے ہی نہیں

کیوں پلٹ کر ادھر نہیں دیکھا
کیا بلاوے وطن کے تھے ہی نہیں

مطمئن تھے درونِ شہر پناہ
ہم سپاہی تو رن کے تھے ہی نہیں

سب نوشتے تو ہم نے دیکھ لئے
وہ حوالے متن کے تھے ہی نہیں

ہائے وہ ربطِ باہمی کی فضا
فاصلے ما و من کے تھے ہی نہیں

اب کھلا ہم پہ وہ سبھی رشتے
تن کے تھے سارے من کے تھے ہی نہیں

بیٹھے بیٹھے یوں کھو جانا
مڑنا، پتھر کا ہو جانا

آنگن آنگن گرد جمی ہے
بارش آنا، سب دھو جانا

سورج جاگنے والا ہوگا
اب تو لازم ہے سو جانا

پھولوں جیسی فصل اگے گی
خوشبو جیسا کچھ بو جانا

جو کچھ سمجھا، کب کافی تھا
کم کم ہی تھا، جو جو جانا

آسانی سے کب آتا ہے
آنسو پینا، خوش ہو جانا

اچھا لیکن، پھر آنے کا
وعدہ کرتے ہو تو جانا

ہر دعا مستجاب کہاں
ہر کوئی باریاب کہاں

سر فروشی کے باب کہاں
اب وہ اگلا نصاب کہاں

اب کے راتیں عذاب ہوئیں
اب کے راتوں میں خواب کہاں

درمیاں واسطہ بھی نہیں
ہم کہاں، آنجناب کہاں

راکھ میں ڈھونڈتے ہو عبث
راکھ میں التہاب کہاں

کیا پتہ، سود ہے کہ زیاں
گوشوارہ، حساب کہاں

خواب کی وادیوں میں کہتے ہیں
رفتگاں کے نشاں مہکتے ہیں

ہم فرشتے رحیم راتوں کے
رتجگوں میں کہیں اترتے ہیں

وادیٔ جاں میں کون اترا ہے
کس کی خوشبو سے ہم مہکتے ہیں

ہم پہ روشن وہ آیتوں کی طرح
ہم اسے حرف حرف پڑھتے ہیں

جان سے بھی ہمیں جو پیارے تھے
کن دیاروں میں اب کے بستے ہیں

وہ جو کھوئے گئے اندھروں میں
آنسوؤں میں کہیں دمکتے ہیں

چاندنی، پھول، شبنمی جھونکے
رنگ، خوشبو، صبا میں بستے ہیں
اک ذرا پیار چاہئے ہوگا
آپ ہم کو خرید سکتے ہیں

جانے کن وادیوں میں لے جائیں
بے نشاں جنگلوں کے رستے ہیں

ارضِ موعود کی تلاش میں ہم
ہجرتوں کے عذاب سہتے ہیں

چھا گیا ہے وہ دیکھو وقتِ زوال
لو بلندی سے ہم سمٹتے ہیں

کیسا شاداب منظر، نظر میں رہا
اک پرندہ برابر سفر میں رہا

میں سفر میں رہا، میں حضر میں رہا
میں صدف میں رہا، میں گہر میں رہا

میری خلوت میں وہ، میری جلوت میں وہ
میں سدا حلقۂ معتبر میں رہا

میں نے شاداب رکھا ہے تجھ کو سدا
تو ہمیشہ مری چشمِ تر میں رہا

خانہ بردوش پھرتے رہے بیشتر
ایک آسیب سا بام و در میں رہا

میرے گھر والے لینے مجھے آگئے
کل بہت دیر تک تیرے گھر میں رہا

نادیدہ آہٹوں کا جہاں بولتا رہا
مردہ سماعتوں میں لہو ڈولتا رہا

اک جاں کہ جانکنی کی سزا جھیلتی رہی
اک درد زندگی کا بھرم کھولتا رہا

پرچھائیں تھی کہ چشم زدن میں گزر گئی
اک عکس آئینے میں سدا ڈولتا رہا

کیا کیا جتن سے خود کو سمیٹا، ہوا طلوع
کوئی پرت پرت مجھے شب کھولتا رہا

عہد وفا کے باب میں حجت تمام کی
بہروں کی انجمن تھی مگر بولتا رہا

گھپ اندھیروں کو اجالا جائے
رات بھر نور اچھالا جائے

سارے مجذوب اکھٹے ہو جائیں
خوب ھو حق ہو، دھمالا جائے

زخم ناسور ہوا جاتا ہے
کیسے یہ تیر نکالا جائے

شام بھی ہے کوئی برزخ لمحہ
رات آئے نہ اجالا جائے

کوئی موتی تو کہیں پر ہوگا
پھر سمندر کو کھنگالا جائے

فکر ایسی بھی کوئی روشن ہو
دور تک جس کا اجالا جائے

اجنبی آیا ہے کوئی ملنے
دوست احباب کو ٹالا جائے

یوں مثالی ہو نوائے کاتبؔ
نسل در نسل حوالہ جائے

اس کا ہونا بھی نہ ہونے جیسا
کیسا پانا کہ ہے کھونے جیسا

بانس کے پاؤں لگا رکھے ہیں
ویسے قد اِس کا ہے بونے جیسا

اک عجب عالمِ بے خوابی ہے
جاگنے جیسا نہ سونے جیسا

نیند پریوں کی اڑانوں جیسی
خواب بچوں کے کھلونے جیسا

معتکف ہونے کو ڈھونڈوں گوشہ
حرمِ پاک کے کونے جیسا

کارِ دشوار کوئی یوں بھی نہ ہو
انگلیاں خوں میں ڈبونے جیسا

زندگی بھر کی کمائی ٹھہرا
ایک احساس کہ کھونے جیسا

سمندر اب کے طوفانی بہت ہے
جزیروں میں ہراسانی بہت ہے

بہت ہے، حشر سامانی بہت ہے
اکیلا دشمنِ جانی بہت ہے

ان آنکھوں میں ابھی پانی بہت ہے
محبت کی فراوانی بہت ہے

یہاں پہلے بھی شاید آچکا ہوں
یہ منزل جانی پہچانی بہت ہے

ہر اک منظر دو بارا دیکھتا ہوں
ادھر کچھ دن سے حیرانی بہت ہے

پرندے لوٹ کر آئیں کہاں سے
ابھی موسم زمستانی بہت ہے

کسی گل پوش منظر میں سما جا
تری آنکھوں میں ویرانی بہت ہے
محبت خوب سودا ہے و لیکن
محبت میں پریشانی بہت ہے

بہت مشکل ہے وعدوں کا نبھانا
مکر جانے میں آسانی بہت ہے

ہوائے نم سندیسہ دے رہی ہے
کھٹاؤں میں ابھی پانی بہت ہے

معانی سے یہاں کس کو ہے مطلب
یہاں لفظوں کی ارزانی بہت ہے

سحر تلک تو پگھلنے کی ٹھان رکھی ہے
دئے کی لو پہ ابھی ہم نے جان رکھی ہے

احد احد کی صدائیں سنائی دیتی ہیں
کسی کی پیٹھ پہ جلتی چٹان رکھی ہے

کسی بھی شاخ پہ یہ بیٹھنے نہیں دیتی
مرے پروں میں یہ کیسی اڑان رکھی ہے

سفر ہے دشت کا، تم بھی ذرا سی لے جانا
چھپا کے چھاؤں تہہِ سائبان رکھی ہے

لگا رہا ہے یہ ہر اک پہ کفر کے فتوے
فقیہِ شہر نے کیا دل میں ٹھان رکھی ہے

ابھی بھی وقت ہے دیدار کا چلے آؤ
ابھی بھی جان میں تھوڑی سی جان رکھی ہے

اسی خموش تبسم کے پیچھے حنیفؔ
چھپا کے ہم نے کوئی داستان رکھی ہے

وادیٔ نور و نار سلام
بوئے گل، نوکِ خار سلام

میں جو لوٹا صدا آئی
اے غریب الدیار سلام

میری بینائی لوٹ آئی
بوئے دامانِ یار سلام

تیری گلیوں چراغ جلیں
تجھ پہ ہو شہر یار سلام

تیری آغوش کھینچتی ہے
مولدِ خاکسار سلام

زخم پر جیسے مرہم ہے
مہرباں یادِ یار سلام

ہمارے حق میں بھی اے آسماں اشارے کر
ہمارے نام سے روشن ترے ستارے کر

بھلے ہی رات انھیں پانیوں پہ کٹ جائے
سحر کے پار، ہمیں دوسرے کنارے کر

ہمارا ذکر زمانے میں پھر سے ارفع ہو
ہمارے سینوں میں محفوظ کچھ سپارے کر

ترے حضور مرا گوشوارہ حاضر ہے
سراپا نفع میں تبدیل سب خسارے کر

قدم قدم پہ ہویدا تری تجلّی ہو
نظر نظر میں فروزاں نئے نظارے کر

ایک خوابوں کا نگر تھا، کیا تھا
اس نگر میں مرا گھر تھا، کیا تھا

وہ خزاں رت کی خموشی جیسا
پھول موسم کی خبر تھا، کیا تھا

کہکشاں پاؤں تلے پھیلی تھی
آسمانوں کا سفر تھا، کیا تھا

سب کے دل جیت لیے پل بھر میں
بات کرنے کا ہنر تھا، کیا تھا

اس کی آنکھوں میں چمک تھی کیا تھی
سیپ میں کوئی گہر تھا، کیا تھا

ایسی بھگدڑ تھی، پتہ بھی نہ چلا
کوئی دستار تھی، سر تھا، کیا تھا

استعارہ تھا سفر کا جیسے
ایک اڑتا ہوا پر تھا، کیا تھا

ربطِ باہم کی بات کرتا تھا
وہ کسی غم کی بات کرتا تھا

رنگ اور آب کا تھا دلدادہ
سبز شبنم کی بات کرتا تھا

کیا تمازت تھی اس کے لہجے میں
برف موسم کی بات کرتا تھا

تھا غزالانِ دشتِ ہُو میں سے
اور سدا رم کی بات کرتا تھا

رتجگوں کے الاؤ آنکھوں میں
شفقِ نم کی بات کرتا تھا

سارے تریاق پاس ہوتے تھے
جب کبھی سم کی بات کرتا تھا

اس کے اطراف دل زدوں کا ہجوم
وہ کہ مرہم کی بات کرتا تھا

ایک درویش تھا وہ کاتب بھی
درد کی دم کی بات کرتا تھا

سیرِ گلشن خراماں کریں
ناز برداریٔ گل عذاراں کریں

کب تلک عرض و فریاد کرتے رہیں
آؤ ہنگامہ اے دل فگاراں کریں

تو کہ گلزار وادی کا شیریں سخن
خیر مقدم ترا گل بداماں کریں

آؤ ڈھونڈیں کسی کشتیٔ نوح کو
آؤ طوفاں سے بچنے کا ساماں کریں

آنکھ کھولیں الاؤ کے اندر کبھی
اور جلنے، پگھلنے کا ساماں کریں

منہ چھپانے کو ڈھونڈے جگہ تیرگی
اب کے سارے میں ایسے چراغاں کریں

ابکہ سوچا ہے دامن سلامت رہے
لاکھ وہ ہم کو حیراں پریشاں کریں

نئی زمین، نئے آسمان رکھ دینا
مرے پروں میں نرالے جہان رکھ دینا

ثبوت تم سے وفا کا اگر کوئی مانگے
وہیں نکال کے قدموں میں جان رکھ دینا

تلاشِ حق کا سفر اور کچھ طویل تو ہو
یقیں کی راہ میں تھوڑا گمان رکھ دینا

ادھر ادھر کے اندھیرے ذرا تو کم ہونگے
دیا جلا کے کوئی، درمیان رکھ دینا

تمام عمر کے سجدوں کا کچھ صلہ تو ملے
کوئی تو داغ عبادت نشان رکھ دینا

ترے وجود کی پرواز آسمانی ہے
مرا وجود سراپا تری نشانی ہے

یہاں پہ تیرا ہی فرمان جاری و ساری
یہ شہرِ دل ہے محبت کی راجدھانی ہے

کھلے فراغ کبھی آؤ ساتھ بیٹھیں گے
بہت طویل حکایت تمھیں سنانی ہے

یہ داغ داغ لبادہ تمھیں پہننا ہے
یہ زخم زخم روایت تمھیں نبھانی ہے

ہمیں پتہ ہے کہاں پانیوں کے سوتے ہیں
کہ ہم نے خاک بہت دشت دشت چھانی ہے

یہ دیوزادوں کا قصہ ذرا تمام تو ہو
پری نژادوں کی آگے حسیں کہانی ہے

دوا میں ہے نہ کسی حرفِ اندمال میں ہے
ہمارے درد کا درماں ترے وصال میں ہے

سلگ رہے ہیں سبھی آس پاس کے منظر
وہ آفتاب صفت جیسے اشتعال میں ہے

ترے عروج کا منظر نہ جانے کیسا تھا
اگر یہ حسن کا عالم ترے زوال میں ہے

پلک جھپکنے میں صدیاں گزرتی جاتی ہیں
غضب کی تیز روی اب کے ماہ و سال میں ہے

تمام حسنِ تکلم، تمام طرزِ ادا
اس اک لطیف تبسم کے خد و خال میں ہے

تمام لذتِ رفتار اک زقند میں پنہاں
تمام دشت کی وحشت، رمِ غزال میں ہے

جہاں غروب ہوا میں، وہیں وہ ابھرے گا
وہ اک کمال سا پنہاں مرے زوال میں ہے

وفورِ شوقِ نمو، گلستاں میں، دیکھو تو
گلاب رت کی تمازت ہر ایک ڈال میں ہے

چاند تاروں میں بسیں صبح تلک
آسمانوں میں رہیں صبح تلک

داستاں ان کی سنیں صبح تلک
ماجرا اپنا کہیں صبح تلک

شبِ تاریک پگھلتی جائے
آگ دہکاتے رہیں صبح تلک

آ اندھیروں میں اجالے بھر دیں
آ مرے خواب جلیں صبح تلک

رات رانی کا بلاوا آئے
سنگ سنگ اس کے بہیں صبح تلک

کچھ خریدیں گے غمِ جاں کے عوض
کچھ تو بیوپار کریں صبح تلک

نالے بن جائیں اذانِ سحری
اشک شبنم میں ڈھلیں صبح تلک

بھٹک گیا تھا پھر سنبھل کے آ گیا
میں راستہ بدل بدل کے آ گیا

عدو بہت ہی شاطر و فطین تھا
عدو سے بھی میں چال چل کے آ گیا

اتر رہی تھی نیند آنکھ میں تبھی
ترا خیال آنکھ مل کے آ گیا

دبا ہوا یہ کون سا ملال تھا
جو آنکھ تک ابل ابل کے آ گیا

میں رائیگاں قیاس کرلیا گیا
تو سکۂ رواں میں ڈھل کے آ گیا

بتاؤ مجھ کو اب کہاں بساؤ گے
کہ میں زمیں سے بھی نکل کے آ گیا

تمھاری مہر مجھ پہ اب لگا ہی دو
لو میں الاؤ سے پگھل کے آ گیا

مقابل عکس کے دیکھو، کوئی تصویر بھی ہوگی
جہاں پر خواب رکھے تھے وہیں تعبیر بھی ہوگی

سمندر تک پہنچ جاؤ تو اتنا دھیان میں رکھنا
سمندر پار کرنے کی کوئی تدبیر بھی ہوگی

مری تقصیرِ الفت پر تو فردِ جرم جائز تھی
مگر یہ کیا پتہ تھا شہر میں تشہیر بھی ہوگی

تمہارے آستانے تک پہنچنا ہی پہنچنا ہے
ہمارے پائے وحشت میں بھلے زنجیر بھی ہوگی

سنو شہرِ ملامت سے ذرا جلدی گذر جانا
یہاں تحقیر بھی ہوگی، یہاں تکفیر بھی ہوگی

گھنیرے جنگلوں میں رات ٹھہری ہے
دمکتے جگنوؤں کے سات ٹھہری ہے

سرِ مژگاں کوئی بارات ٹھہری ہے
تری بخشش، تری سوغات ٹھہری ہے

ابھی قوسِ قزح کے رنگ بکھریں گے
ابھی جل تھل برس، برسات ٹھہری ہے

تری محفل میں جیسے سب کے ہونٹوں پر
مری وارفتگی کی بات ٹھہری ہے

مسلسل اب میں چلّے کھینچتا ہوں
دعاؤں پر بسر اوقات ٹھہری ہے

میں سورج ہوں مجھے جانا پڑیگا
مری خاطر سنا ہے رات ٹھہری ہے

وہی ساعت جو مدت سے منور تھی
وہی اب مرکزِ ظلمات ٹھہری ہے

تو یارب! آج ہی برپا قیامت ہو
قیامت ہی اگر میقات ٹھہری ہے

سنا ہے قافلے کے ساتھ، خیموں میں
کوئی درماندگی دن رات ٹھہری ہے

در پہ تیرے میں یار آیا ہوں
کیسے دیوانہ وار آیا ہوں

عشق بے اختیار ہوتا ہے
دیکھ بے اختیار آیا ہوں

کون دیکھیں جواب دیتا ہے
ویسے سب کو پکار آیا ہوں

اے رفو گر تری دہائی ہے
دامنِ تار تار آیا ہوں

میں نے رضواں سے دل لگی میں کہا
میں یہاں پہلی بار آیا ہوں

پر شکستہ ہوں، پر سمیٹنے دو
کوہساروں کے پار آیا ہوں

میری نصرت کا اہتمام کرو
میں ہوں ہجرت گذار، آیا ہوں

میں کہ صحرا کا ایک باشندہ
دیکھنے آبشار آیا ہوں

آخری داؤں جیتنے کے لئے
اپنا سب کچھ میں ہار آیا ہوں

غزل سرا ہوں میں پہلو میں درد ہوتے ہوئے
شگفتہ ہوں ابھی صحرا نورد ہوتے ہوئے

چمن میں چار سو اک مردنی سی چھائی ہوئی
گلوں کے تختے لگاتار زرد ہوتے ہوئے

وہ برف گرتی ہوئی شعلہ جذبوں پر
تعلقات کے موسم تھے سرد ہوتے ہوئے

عدو کے جشنِ طرب میں خوشی سے شامل تھا
وہ اک اسیر قبیلے کا فرد ہوتے ہوئے

شکست سر پہ کھڑی تھی میں رن میں جب پہنچا
افق پہ آخری منظر تھا گرد ہوتے ہوئے

کوئی حیرت کسی منظر سے نکل کر آئے
کوئی پیکر کسی پتھر سے نکل کر آئے

ساحلِ خواب پہ کب تک میں تہی دست رہوں
کوئی موتی تو سمندر سے نکل کر آئے

میں کڑی دھوپ میں بیٹھا ہوں، کوئی پرچھائیں
کسی دیوار، کسی در سے نکل کر آئے

اب کھلا مجھ پہ عقب بھی مرا مامون نہ تھا
مرے دشمن تو مرے گھر سے نکل کر آئے

ریگزاروں سے اٹھے گرد بلا کی صورت
اور تلاطم کہ سمندر سے نکل کر آئے

خیر مقدم کو کھڑے ہونگے سبھی سرو قداں☆
تو جو شمشاد و صنوبر سے نکل کر آئے

☆ میرے دوسرے بیٹے فراز احمد کی نذر

سمندر تاک میں بیٹھا ہوا ہے
کوئی ڈر خاک میں بیٹھا ہوا ہے

عقیدت سے معطر ایک لہجہ
درودِ پاک میں بیٹھا ہوا ہے

وہ شعلہ ہے جلادے گا سراپا
خس و خاشاک میں بیٹھا ہوا ہے

دیے کی لو کترنے کا ہنر بھی
کف سفاک میں بیٹھا ہوا ہے

گماں کی حد سے بھی ہے ماورا وہ
کہاں ادراک میں بیٹھا ہوا ہے

شرارہ پھر سے دامن تھام لے گا
ابھی تک راکھ میں بیٹھا ہوا ہے

یہ رہ رہ کر ادھر کیا دیکھتا ہوں؟
وہ کیا افلاک میں بیٹھا ہوا ہے

وہ آخری پڑاؤ مرے بانکپن کا تھا
پھر اس کے بعد سلسلہ سارا تھکن کا تھا

چرچے بھی پارسائی کے سب محفلوں میں تھے
زنداں میں تذکرہ بھی کسی پیرہن کا تھا

پھر کیوں مجھے مزار کی قسمت بنا دیا
میں بھی تو ایک پھول تمہارے چمن کا تھا

میرے لئے تو گھر کے اجالے کی بات تھی
تیرے لئے سوال تو بس اک کرن کا تھا

پھر یوں ہوا کہ زادِ سفر سب بکھر گیا
بھگدڑ مچی تو ہوش کہاں تن بدن کا تھا

میں سرفروشیوں کی روایات کا امیں
شہرہ تمام رن میں مرے بانکپن کا تھا

پل بھر میں روم روم شرابور کر گیا
خوشبو کا جیسے جھونکا وہ میرے وطن کا تھا

وہ ہمرہانِ جاں سے بچھڑنے کی رات تھی
رنجِ سفر کی داستان، قصہ تھکن کا تھا

پیرہن ہفت رنگ کافی ہے
خوش لباسی کا ڈھنگ کافی ہے

یہ ترا آسمان ہے کتنا
ایک میری پتنگ کافی ہے

سارے مجذوب اک طرف ہولیں
اس طرف یہ ملنگ کافی ہے

کیسے کیسے نقوش ابھرے ہیں
بدگمانی کا رنگ کافی ہے

روشنی منعکس نہیں ہوتی
ایسا لگتا ہے زنگ کافی ہے

پاک دامن کی سنگساری کو
ویسے بھی ایک سنگ کافی ہے

دیدنی ہے یہ وادیٔ کہسار
اس پہ یہ جلترنگ، کافی ہے

کوئی بھی رنگ کب نکھرنے دے
خودنمائی کا زنگ کافی ہے

کوئی پھیلاؤ آسماں جیسا
یہ زمیں ویسے تنگ کافی ہے

ہم قناعت پسند ہیں، ہم کو
حسرتِ نام و ننگ کافی ہے

کہاں یقین کی آسودہ منزلوں کے نشاں
کہاں ہنوز گماں وادیوں میں سر گرداں

ہمیں نے تیری امانت سنبھالی بالآخر
ہمیں نے سر پہ اٹھایا ہے بارِ کوہِ گراں

وہ عکس عکس تجلی تھی خیرہ کن کتنی
درونِ آئینہ خانہ کہ دیدنی تھا سماں

ہوا بھی میری طرح ہی ملول تھی کتنی
تمہارے شہر سے گذری فسردہ، نوحہ کناں

خدا کرے کہ یہاں کچھ تو جوئے شیر سا ہو
پٹک رہا ہوں میں کب سے یہاں پہ تیشۂ جاں

وہ پچھلی رت کہ سراسر زیاں نصیب رہے
چلو اٹھاتے ہیں پھر سے حسابِ سود و زیاں

صدف نے اپنی حفاظت میں لے لیا آخر
سمندروں کی امانت تھا قطرۂ نیساں

کسی کو جچتا نہیں کیا وہ یار خوش قامت
یہ شہرِ دیدہ وراں ہے کہ شہرِ کم نظراں

یہ موج موج ہمیں کیا سنانا چاہتا ہے
سمجھتے کاش کبھی ہم سمندروں کی زباں

صحراؤں کا دل بہلاتے رہتے ہیں
بادل ویسے کچھ برساتے رہتے ہیں

ملبہ اپنے اوپر گرتا رہتا ہے
باہم سیارے ٹکراتے رہتے ہیں

دل ضدی ہے کب کس کی سننا چاہے
ہم اکثر اس کو سمجھاتے رہتے ہیں

وحشت ویسے گھٹتی بڑھتی رہتی ہے
موسم ہم پر آتے جاتے رہتے ہیں

عطر فروشوں سے نسبت ہے اپنی
ہم سارا عالم مہکاتے رہتے ہیں

ہم بھی آجاتے ہیں ان کی باتوں میں
اکثر آئینے بہکاتے رہتے ہیں

دل ویرانے میں اکثر رات گئے
سائے جیسے آتے جاتے رہتے ہیں

مہک اٹھیں گے جنوب سارے، شمال سارے
وصال موسم میں اب کے ہونگے نہال سارے

ہمارے حصے یہ جہد ساری، ملال سارے
تمھیں مبارک بشارتیں سب، مآل سارے

نواحِ جاں میں گلاب موسم اتر رہے ہیں
خوشا، کہ خوشبو سے ربط ہونگے بحال سارے

پڑاؤ اگلا کہاں پہ ہوگا، قیام کب تک؟
سفر سے لوٹا تو پھر سے ہونگے سوال سارے

میں آرہا ہوں، خراج لینے میں آرہا ہوں
سمندر! اپنی تہوں سے موتی نکال سارے

سرِ بیاباں فراق دیدوں کا جشن ہوگا
تو شامِ وحشت ملیں گے رقصاں غزال سارے

نئی رتوں کا نقیب ہوگا گلاب منظر
کہ زرد موسم پہ پھینک دینا زوال سارے

تیرے دروازے جو آیا ہوا ہے
وہ زمانے کا ستایا ہوا ہے

آج لگتا ہے قیامت کی طرح
آج اپنا بھی پرایا ہوا ہے

تیرا پیغام ادھورا سا لگا
ایسا لگتا ہے، مٹایا ہوا ہے

ایسی رنگت کہیں دیکھی نہ سنی
کچھ تو میدے میں ملایا ہوا ہے

بے خودی ایسی کہ الحمد للہ
جو بھی کھویا تھا وہ پایا ہوا ہے

ترے وحشی نے گلابی رت میں
آسماں سر پہ اٹھایا ہوا ہے

دیس پردیس بھٹکتا ہے سدا
جانے کیا سر میں سمایا ہوا ہے

دھڑکنیں تیز ہوئی جاتی ہیں
کوئی لگتا ہے کہ آیا ہوا ہے

مجھ پہ الزام بجا انجمن آرائی کا
ایک عالم کہ ہے شیدا ترے سودائی کا

جاں بلب تھا جو کبھی، نغمہ بلب رہتا ہے
معجزہ دیکھ تو لے اپنی مسیحائی کا

منزلوں منزلوں پھیلا ہوا حیرت کا سفر
اور ہر گام ٹھٹھکنا وہ تماشائی کا

ہم تو صحرا میں بھی شاداب رہا کرتے ہیں
تذکرہ رہتا ہے ہر دم تری رعنائی کا

ہم بھی ایسے ہی پہنچتے ہیں تری چوکھٹ پر
جیسے دریا پہ پہنچنا کسی صحرائی کا

جھیل سی آنکھیں تھیں اترا تھا کہ بس ڈوب گیا
کوئی اندازہ نہ کر پایا میں گہرائی کا

ترے نشاں تک پہنچ رہا ہوں
میں لامکاں تک پہنچ رہا ہوں

مجھے فرشتے بلا رہے ہیں
میں آسماں تک پہنچ رہا ہوں

یہاں سے آگے تمہاری مرضی
حدودِ جاں تک پہنچ رہا ہوں

مری شکایت وہ جان لے گا
دبی زباں تک پہنچ رہا ہوں

کہاں کہاں سے بلا رہا ہے
کہاں کہاں تک پہنچ رہا ہوں

میں ہر طرف سے سنائی دوں گا
ابھی زباں تک پہنچ رہا ہوں

بہت کٹھن مرحلوں سے ہو کر
میں ناسے ہاں تک پہنچ رہا ہوں

جہاں تہاں سے نکل کے آؤ
میں درمیاں تک پہنچ رہا ہوں

خوشی کے نغمے سنائی دیں گے
کہ نوحہ خواں تک پہنچ رہا ہوں

تذکرہ راہگذر تک پہنچا
آخرش رنجِ سفر تک پہنچا

کھوجتے کھوجتے قدموں کے نشاں
قافلہ چاند نگر تک پہنچا

چھاؤں تھی، شاخِ ثمرور بھی تھی
میں تھکا ہارا شجر تک پہنچا

میں، کسی شعلہ نفس کا اعجاز
راکھ تھا، رقصِ شرر تک پہنچا

رات بھر چاند کے ہمراہ رہا
صبح، کرنوں کے نگر تک پہنچا

ختم ہو، خانہ بدوشی کا عذاب
بے گھری! آ، مجھے گھر تک پہنچا

کیسی دھن تھی کہ سمائی دل میں
کیسا سودا تھا کہ سر تک پہنچا

عشق کا کیف و کم سمجھتے ہیں
درد کا زیر و بم سمجھتے ہیں

ہم تلاطم صفت اگرچہ ہیں
پر کناروں کا غم سمجھتے ہیں

رتجگوں کے الاؤ شاہد ہیں
آخرِ شب کا نم سمجھتے ہیں

محرمِ جاں! یہ تذکرہ تیرا
جتنا زیادہ ہو کم سمجھتے ہیں

خاک اپنی وہیں پہ پہنچے گی
دیر میں ہیں، حرم سمجھتے ہیں

جلوہ افروز ہو نہیں سکتے
ان کی مجبوری ہم سمجھتے ہیں

درد کہ حرزِ جاں سہی اپنا
غم کو ہم محترم سمجھتے ہیں

پیچھے پیچھے تمھارے آئینگے
نقش ہائے قدم سمجھتے ہیں

تقاضہ اب کے ہوگا جسم وجاں کا
سفر در پیش ہے دشتِ زیاں کا

وہ اندھوں میں اجالے بانٹتا تھا
بھلا سا نام تھا اس مہرباں کا

جزیرہ ہر طرف سے کٹ گیا ہے
بچا ہے کچھ علاقہ درمیاں کا

ہوائیں کیوں مٹانے پر تلی ہیں؟
نشاں جلتا ہوا اک بے نشاں کا

خس و خاشاک جل جائے تو اچھا
دہانہ کھول دے آتش فشاں کا

وہی اک روح فرسا رت یہاں پر
وہی اک خوں چکاں موسم وہاں کا

کوئی فریاد سوئے آسماں جائے
پتہ دے اس کو اک اجڑے جہاں کا

دہکتا لمس اک آتش نفس کا
بیاں کوئی کسی شعلہ بیاں کا

کوئی نالہ کہیں اطرافِ جاں سے
کسی محراب سے نعرہ اذاں کا

بشارت اب کسی اک خوش دہن سے
اشارہ ہو کسی اک رازداں کا

بلا کا جوش اب کے جزر و مد میں تھا
جزیرہ رات بھر طوفاں کی زد میں تھا

اشارہ اس طرف سے بھی نہ تھا کوئی
جنوں میرا ابھی اس دن اپنی حد میں تھا

چمن میں ہر کوئی حیرت سے تکتا تھا
غضب کا بانکپن اس سرو قد میں تھا

مجھے مجرم تو ٹھہرایا گواہوں نے
مگر منصف ابھی تک ردو کد میں تھا

مکاں تا لامکاں، بس ایک حیرانی
وہی حسنِ ازل، رنگِ ابد میں تھا

مری پرواز کو افلاک نے روکا
مجھے اڑنا بھی شاید ایک حد میں تھا

یہ کیسا حشر ساماں شور اٹھا ہے
بہت آرام سے میں تو لحد میں تھا

یقیں ویسے گماں کی زد پہ ٹھہرا ہے
جنوں کا شائبہ جیسے خرد میں تھا

سپردگی میں سعادت کہاں سے لاؤ گے
شہادتوں کی وراثت کہاں سے لاؤ گے

بتاؤ شہرِ ریا کے منافقوں کے لئے
حدیثِ دل کی روایت کہاں سے لاؤ گے

سنا وہاں پہ فصیح اللسان ہیں سارے
مناظرے کو فصاحت کہاں سے لاؤ گے

سلامی دینے کو حاضر ہیں سارے درباری
پہ بادشاہ سلامت کہاں سے لاؤ گے

شمار ہونا ہے شب زندہ دار لوگوں میں
تو صبح گاہی کی عادت کہاں سے لاؤ گے

کسی کے شجرۂ عالی نسب میں جڑنا ہے
تو خاندانی نجابت کہاں سے لاؤ گے

لو خانقاہوں پہ قبضہ تو ہوگیا اپنا
مگر بتاؤ ولایت کہاں سے لاؤ گے

مری تلاش میں صحرا تلک پہنچ تو گئے
مرا جنوں مری وحشت کہاں سے لاؤ گے

شمار کر تو لیا اپنا شعر گویوں میں
سخن وروں کی شہادت کہاں سے لاؤ گے

یہ کھائی پاٹ دیں کیا
یہ شہ رگ کاٹ دیں کیا

گراں ہے یہ وراثت
شرافت بانٹ دیں کیا

کہاں فصلیں پکی ہیں
ابھی سے پھاٹ دیں کیا

گھٹا ساون کے دن ہیں
تمہیں بھی ٹاٹ دیں کیا

بدی نیکی بہم ہیں
کہو ہم چھانٹ دیں کیا

صدا بھی تو نہیں دیتے
زباں بھی کاٹ دیں کیا

رات بھر تھا میں کسی خواب میں گم
موج در موج تھا گرداب میں گم

گھرے پانی کا شناور تھا کبھی
دیکھنا اب اسے پایاب میں گم

وجد میں آؤں تو رقصاں سرِ بزم
اور کبھی خلوتِ محراب میں گم

ایک فریاد گلو بستہ رہی
جیسے نغمہ کسی مضراب میں گم

دربدر ہونا مقدر ٹھہرا
جب توکل ہوا اسباب میں گم

ہم سے حیرت کا سفر طے نہ ہوا
ہم کہ تھے منظرِ نایاب میں گم

خشک ہوں آنکھیں تو ڈھونڈیں ترا عکس
تو کہاں جا کے ہوا آب میں گم

طاقِ نسیاں پہ دھرا رہ گیا کوئی وعدہ
خوابِ غفلت میں پڑا رہ گیا کوئی وعدہ

اگلی برسات انھیں یاد دلانے کے لئے
سوکھے موسم میں ہرا رہ گیا کوئی وعدہ

وقتِ رحلت ترا پیغام وہیں بھول گئے
تہہِ اسباب دبا رہ گیا کوئی وعدہ

بات خوشبو کی طرح چاروں طرف پھیل گئی
رازداری کا کھلا رہ گیا کوئی وعدہ

اس نے پھولوں کے نگر نقل مکانی کرلی
ریگزاروں میں دھنسا رہ گیا کوئی وعدہ

پہلے شنوائی کی سبیل بھی تھی
دید کی ساعتِ جمیل بھی تھی

میری زنجیرِ پا تھی ویسے دراز
قید کے ساتھ تھوڑی ڈھیل بھی تھی

یاد آتا ہے مقبروں کے قریب
ٹوٹی پھوٹی کوئی فصیل بھی تھی

تیری حاجت بھی گاہے گاہے رہی
زندگی ویسے خودکفیل بھی تھی

ہم کو معتوب یونہی ٹھہرایا
یا ترے پاس کچھ دلیل بھی تھی

اب کے بازار مصر کا بھی نہ تھا
اور قیمت بہت قلیل بھی تھی

عبث خاشاک و خس کا تذکرہ ہوگا
کہاں شعلہ نفس کا تذکرہ ہوگا

ترے حیرت کدے کی بات نکلی تو
مری چشمِ ہوس کا تذکرہ ہوگا

ہماری پیش قدمی اور پسپائی
کہاں تک پیش و پس کا تذکرہ ہوگا

کسی کی بے بسی تک بات پہنچے گی
کسی کی دسترس کا تذکرہ ہوگا

سنا ہے آج شب شہرِ خموشاں میں
کسی عیسیٰ نفس کا تذکرہ ہوگا

الاؤ جب جلائے جا رہے ہونگے
کہاں خاشاک و خس کا تذکرہ ہوگا

رہائی کی دعائیں مانگی جائینگی
اسیروں کا، قفس کا تذکرہ ہوگا

سفر کے راز، سفر کی تھکان کھولے گی
ہماری آبلہ پائی زبان کھولے گی

بلندیوں سے بندھا ہر نشان کھولے گی
بہار آ کے ہماری اڑان کھولے گی

تھکا ہوا یہ بدن تو پناہ ڈھونڈے گا
سفر کی چاہ نئے بادبان کھولے گی

فصیلِ جسم ترے راستے میں حائل ہے
کبھی تو آ کے اجل میری جان کھولے گی

یہ ہجرتوں کا سفر ختم ہو گا کبھی
یہ بے گھری کوئی جائے امان کھولے گی

سنا کہ حسنِ سماعت ہے منتظر کب سے
یہ بے زبانی تری کب زبان کھولے گی

کوئی سنبھالے امانت مری اداسی کی
میں سونپ دوں یہ وراثت مری اداسی کی

خوشی خوشی میں ترے ساتھ ہی چلا آؤں
اگر چکائے تو قیمت مری اداسی کی

حضورِ بانوئے عشرت جو آج پیشی ہے
کسی نے کی ہے شکایت مری اداسی کی

ہر ایک سمت جو خوشیوں کے رنگ مہکائے
اسی کے نام خلافت مری اداسی کی

سنا ہے جشنِ مسرت منایا جائے گا
تو آؤ، لے لو اجازت مری اداسی کی

چلے بھی آؤ کبھی حلقۂ ارادت میں
کھلے گی تم پہ فصاحت مری اداسی کی

جنسِ نایاب ہیں ارزانی کے ہوتے
بیش قیمت ہیں فراوانی کے ہوتے

میں ترے شہر میں رکتا کوئی دن اور
کارِ دیگر نہ جہاں بانی کے ہوتے

اتنی کثرت سے نہ ہوتے جو میسر
ایسے سودے کہاں ارزانی کے ہوتے

رنگ تتلی کی اڑانوں میں مہکتے
سلسلے ایسے بھی حیرانی کے ہوتے

ایسے بکھرا تو نہ جاتا یہ تعلق
کچھ اگر سلسلے جنبانی کے ہوتے

تشنگی ڈھونڈتی ہے اور سبیلیں
ہم تو پیاسے ہی رہے پانی کے ہوتے

کس کو درکار تھا مصنوعی تعطر
رات مہکاتی ہوئی رانی کے ہوتے

نفس سرکش ہے نکل بھاگے ہے دیکھو
دونوں اطراف نگہبانی کے ہوتے

کہکشاں، پھول، صبا اور نہ جانے کیا کیا
ہم ترے شہر کو لائے ہیں سجانے کیا کیا

بیش قیمت ہے تری خاک جواہر سے بھی
دفن آغوش میں تیرے ہیں خزانے کیا کیا

ہفت رنگی ہے ترا پیرہنِ دل آویز
تونے دیکھے ہیں دھنک رنگ زمانے کیا کیا

میری آنکھوں میں سمٹ آئے ہیں منظر کیسے
میرے ہونٹوں پہ مچلتے ہیں ترانے کیا کیا

میرے بچپن کا اثاثہ، میرے پرکھوں کا وقار
تونے دامن میں چھپا رکھا ہے جانے کیا کیا

شہرِ دلدار سے اس قریۂ نا پرساں تک
ہر قدم چھوڑ کے آئے ہیں خزانے کیا کیا

تم نے یوں پوچھا مرا حال کہ دل بھر آیا
پھر سے لو دینے لگے داغ پرانے کیا کیا

الف لیلہ تری اب تک یونہی جاری ساری
ہم سناتے ہیں ترے سب کو فسانے کیا کیا

کیا بتائیں تیری بانہوں میں سمانے کے لئے
ہم سدا ڈھونڈتے رہتے ہیں بہانے کیا کیا

ہم دشت نوردی کی برکت بھی اٹھا لائے
گھر لوٹے تو صحرا کی وسعت بھی اٹھا لائے

ہم طور سے لوٹے تو تا حشر جھلنے کو
انکار کے شعلوں کی حدت بھی اٹھا لائے

سنتے ہیں وہاں اب تو بس خاک ہی اڑتی ہے
دیوانے تو صحرا سے وحشت بھی اٹھا لائے

کیا کیا نہ ہمیں بخشا اس دستِ ستمگر نے
ہم دیدۂ گریاں کی دولت بھی اٹھا لائے

بازارِ تمنا میں، کیا خوب کیا سودا
بیچا بھی نہیں خود کو، قیمت بھی اٹھا لائے

اس شہرِ ملامت سے، نصرت نہ ملی ہم کو
اس بار جو لوٹے تو، ہجرت بھی اٹھا لائے

پھولوں کی زیارت سے جب جی نہ بھرا کاتبؔ
رنگت بھی چرا لائے، نکہت بھی اٹھا لائے

مرے وجود میں شامل ہے بے کرانی بھی
مرے جمال کا اک رنگ آسمانی بھی

ڈبو رہی تھی سفینے کئی، روانی بھی
بہت زیادہ تھا آنکھوں میں رات پانی بھی

ہم اہلِ جذب وجنوں کے سفارشی ٹھہرے
ہمیں کریں گے کبھی ان کی ترجمانی بھی

میں چاندنی کے فسوں کا اسیر، پہلے سے
مہک کے بلاتی ہے رات رانی بھی

میں روشنی کے تعاقب میں بھاگتا ہی رہا
کہ کھو نہ جائے تری آخری نشانی بھی

افق اجال رہا ہے سپیدۂ صادق
چلو تمام ہوئی ہے مری کہانی بھی

ابھی بڑھاپا کئی موسموں کی دوری پر
ابھی سے روٹھ گئی ہے مری جوانی بھی

مہرباں مجھ پہ ، وہ دلدار کہاں تھا پہلے
درد پہلو میں لگاتار کہاں تھا پہلے

ہم تری آگ میں جل کر ہی تو نایاب ہوئے
کوئی مٹی کا خریدار کہاں تھا پہلے

کتنے دشوار تھے ایام جہانبانی کے
جیسے جنت میں ہوں بیکار، کہاں تھا پہلے

درودیوار پہ اک چھت بھی ہوا کرتی تھی
یہ مکاں اتنا ہوادار کہاں تھا پہلے

مجھکو انصاف ملے گا، یہ توقع کب تھی
میں بیاں دینے پہ تیار کہاں تھا پہلے

یہ کرشمہ بھی اسی دستِ رفوگر کا ہے
ورنہ دامن میں یہ زرتار کہاں تھا پہلے

بے جھجک آگ کے شعلوں سے لپٹ جاتا تھا
جل گیا میں، کہ سمجھدار کہاں تھا پہلے

میرے ہمراہ یہاں بادِ بہاری آئی
یہ بیابان تھا، گلزار کہاں تھا پہلے

سرِ محضر ہمارا نام ہے اب کے
ہمارے سر پہ ہی الزام ہے اب کے

فضیلت یافتہ وہ تیری محفل کا
گلی کوچوں میں کیوں بدنام ہے اب کے

سحر تک رات کو آراستہ کرنا
یہ طے پایا ہے میرا کام ہے اب کے

ہمارے لب پہ بھی لبیک جاری ہو
ہمارے تن پہ بھی احرام ہے اب کے

نہیں خواجہ سراؤں کی کوئی سازش
نہ نیزے پر کوئی پیغام ہے اب کے

نہ صحرا میں کوئی ہنگامۂ وحشت
نہ محفل میں کوئی کہرام ہے اب کے

سبھی کارِ جہاں تکمیل کو پہنچے
سفر سے لوٹ کر آرام ہے اب کے

یہ ملبہ خزاں کا اٹھانا پڑے گا
بہاروں کو پھر سے بلانا پڑے گا

یہیں رفتگاں کے نشانات ہونگے
یہیں سے ہمیں آگے جانا پڑے گا

سنا دشتِ جاں جیسے ہی پار ہوگا
تو فوراً ہی ان کا ٹھکانہ پڑے گا

ابھی چاک سے تو اتاری ہے مٹی
ابھی آگ میں بھی جلانا پڑے گا

ابھی جان باقی ہے اس ناتواں میں
تمہیں اور کچھ دن تو آنا پڑے گا

یہ دیوار کب تک اٹھانی پڑے گی
خزانہ یہ کب تک چھپانا پڑے گا

کناروں پہ تھوڑے ہی ملتے ہیں موتی
سمندر کی تہہ تک تو جانا پڑے گا

سحر کی سفیدی نمودار ہو گی
الاؤ کو تب تک جلانا پڑے گا

میں اوڑھے ہوئے گرد یونہی پڑا تھا
مجھے چھوڑ کر قافلہ جا چکا تھا

ترے آستاں تک پہنچتا بھی کیسے
میں تیرے مضافات میں کھو گیا تھا

جو کیکر کی شاخوں پہ کچھ دھجیاں تھیں
کسی کا لبادہ پھنسا رہ گیا تھا

الاؤ میں تیرے پگھلنے سے پہلے
مجھے آگ میں اپنی جلنا پڑا تھا

چلو دیکھتے ہیں کہ کیا پھوٹتا ہے
ادھر سنگِ در ہے ادھر میرا ماتھا

مرا رنگ ایسے کہاں تھا سنہرا
پگھلنے سے پہلے کوئی دوسرا تھا

کوئی بات تم سے چھپی رہ گئی تھی
کوئی بوجھ سا روح پر رہ گیا تھا

ہم لپکتی ہوئی شعلوں کی زباں تک پہنچے
خاک ہوکر ہی تو اس طرزِ بیاں تک پہنچے

تری دہلیز سے اٹھ کر نہیں جانے والے
کتنے فرسنگ چلے ہیں تو یہاں تک پہنچے

سیلِ آزادیٔ اظہار کو روکے کوئی
اس سے پہلے کہ یہ خطرے کے نشاں تک پہنچے

ڈھونڈئے جائے اماں کوئی کمر کھولنے کو
شام کے سائے بھی لو سرحدِ جاں تک پہنچے

چاندنی ریت کی لہروں پہ جہاں ڈولتی ہے
ہم غزالوں کے تعاقب میں وہاں تک پہنچے

اب تو حد پار ہوئی بے سروسامانی کی
کوئی بخشش تری اب کاسۂ جاں تک پہنچے

تیری اک بولی پہ سرمایۂ جاں بیچ دیا
تیرے دیوانے کہاں سودوزیاں تک پہنچے

شام سنولا گئی اب تو چلو لوٹ چلیں
لو پرندے بھی تو اب جائے اماں تک پہنچے

یہ معجزہ ہی سہی، اب کی بار ہو جائے
غریبِ شہر کوئی شہریار ہو جائے

مری زمین پہ اتریں گلوں کے پیغمبر
یہ ریگزار مرا لالہ زار ہو جائے

تمام عمر کی آشفتگی کو چین ملے
وہ بے نیاز اگر بے قرار ہو جائے

دھنک کے ساتھ سروں پر میں رقص کرتا رہوں
وہ رنگ مجھ پہ اگر آشکار ہو جائے

یہ دل علاقہ اسے گھیر گھار کر رکھو
کوئی عدو نہ کہیں دعویدار ہو جائے

ہمارے بیچ نیا کوئی رابطہ نہ سہی
پرانا ربط وہی استوار ہو جائے

ہمسری آسمان سے کم ہے
آسماں بھی اڑان سے کم ہے

سرفرازی نشان سے کم ہے
تو ابھی خاندان سے کم ہے

عشق معیار تک نہیں پہنچا
دوستی امتحان سے کم ہے

آج دریا کو پار کرلیں گے
آج پانی نشان سے کم ہے

اب وہ انداز دلبری کے کہاں
اب مسیحائی جان سے کم ہے

اک لمبی چھلانگ، دیوانے
زور تیرا، مکان سے کم ہے

میرے حصے میں آئی ہے جو زمیں
اس کا رقبہ مکان سے کم ہے

خاک سے کب میں نکل سکتا ہوں
ہاں تری آگ میں جل سکتا ہوں

میں نے جو مانگا ہے دیدے مجھکو
دیکھنا میں بھی مچل سکتا ہوں

میں ہوں مخمورِ ازل سے ساقی
میں بھلا کیسے سنبھل سکتا ہوں

میری سیال صفت ہے تخلیق
میں ہر اک شکل میں ڈھل سکتا ہوں

مجھے للکار کے دیکھو تو سہی
تم سے آگے بھی نکل سکتا ہوں

تو مرا ہاتھ پکڑ، تھام تو لے
اور کتنا میں اچھل سکتا ہوں

سوچ لے کیسے سمیٹے گا مجھے
میں تو جب چاہوں پگھل سکتا ہوں

فقط دعا ہی اجابت کی شرط ٹھہری تھی
کہ اضطراب کی، رقت کی شرط ٹھہری تھی؟

میں لوٹ آیا تو پھر اجنبی رویہ کیوں
مراجعت ہی تو رخصت کی شرط ٹھہری تھی

غمِ فراق ہی ٹھہرا تھا باعثِ وحشت
سپردگی ہی محبت کی شرط ٹھہری تھی

مجادلے میں روا اب ہیں طعن اور تشنیع
کہاں پہ فہم و فراست کی شرط ٹھہری تھی

تو پھر ہماری صفوں میں وہ کیسے شامل ہیں
منافقت تو عداوت کی شرط ٹھہری تھی

کسی سے عہدِ اطاعت بحال رکھنا ہے
کسی کے ساتھ عداوت کی شرط ٹھہری تھی

بس ایک بار وہ آنگن جو ہم سے چھوٹ گیا
تو پھر کہاں پہ کسی چھت کی شرط ٹھہری تھی

شبِ فراق اسی اک امید پر کاٹی
دمِ وصال سخاوت کی شرط ٹھہری تھی

دشت میں موجِ ریگ سی ابھری
یوں لگے جیسے تشنگی ابھری

پھر درِ جاں پہ کوئی دستک سی
پھر رگ و پے میں سنسنی ابھری

پھر تمہاری کمی ہوئی محسوس
پھر مری آنکھ میں نمی ابھری

مجھ کو پہلی ہی موج لے ڈوبی
مستزاد اس پہ دوسری ابھری

اب کناروں پہ جشن برپا ہو
دشمنی ڈوبی، دوستی ابھری

کھلبلی سی مچی ہے ساحل پر
رات سنتے ہیں جل پری ابھری

ایسے لگتا تھا شاخ سوکھ گئی
ایک پتی، تبھی، ہری ابھری

سراغِ محفلِ مہتاب ڈھونڈنے جائیں
چلو کہ رات ہوئی، خواب ڈھونڈنے جائیں

وفود آنے لگے بانجھ سرزمینوں سے
کہ کوئی خطّۂ شاداب ڈھونڈنے جائیں

جہاں پہ چاند ستارے قیام کرتے ہیں
وہی وہ وادیٔ سیماب ڈھونڈنے جائیں

کہیں تو دریا گذرنے کا راستہ دیگا
کہیں تو ہوگا یہ پایاب ڈھونڈنے جائیں

نظارے خاک ہوئے کثرتِ تماشہ سے
چلو مناظرِ نایاب ڈھونڈنے جائیں

وہیں پہ ہوگا نخیلوں کے آس پاس حنیفؔ
کسی سراب میں غرقاب، ڈھونڈنے جائیں

شبنمی لمس جب گدگدانے لگا
ایک غنچہ دہن مسکرانے لگا

میں کناروں سے باہر چھلکتا رہا
کوئی دریا جو مجھ میں سمانے لگا

تو بلاتا ہے تو، راستہ کھول دے
کوئی سیڑھی مجھے آنے جانے لگا

عشق کا بوجھ ہے، کب اٹھا پائیگا
زور کتنا بھی تو اے دوانے لگا

چاک پر کب سے رکھا ہوا ڈھیر ہوں
میری مٹی کو اب تو ٹھکانے لگا

سرنگوں ہو رہے تھے تناور درخت
ایک پودا تبھی سر اٹھانے لگا

کتنے نغمے رگِ جاں میں بیتاب ہیں
دیکھ، سر تا پا میں سنسنانے لگا

درمیاں راستہ جب کھلا رہ گیا
کوئی آنے لگا، کوئی جانے لگا

ہم نے میراث میں یہ زندہ دلی پائی ہے
اک تجوری زر و زیور سے بھری پائی ہے

نوحہ خواں آتی ہیں اجڑے ہوئے ویرانوں سے
ان ہواؤں میں ہمیشہ ہی نمی پائی ہے

ہم نے دیکھے ہی کہاں سطوتِ ماضی کے نشاں
ہم نے ورثے میں تو یہ دربدری پائی ہے

آج صحرا سے کوئی گرد کا بادل نہ اٹھا
آج دیوانے میں وحشت کی کمی پائی ہے

کتنا آنکھوں کو بہایا تو یہ بینائی ملی
کتنا پگھلے ہیں تو یہ شعلہ رخی پائی ہے

لہلہاتا ہی رہوں گا میں، کوئی موسم ہو
چشمِ بد دور، طبیعت ہی ہری پائی ہے

زیرِ محراب ایک چراغ
جھلملاتا ہے دیکھ چراغ

جل اٹھے گی تمام تاریکی
تو اندھیرے میں پھینک چراغ

عکس در عکس نور ہی نور
اک چراغ اور انیک چراغ

گنگناتا ہے جیسے سناٹا
مسکراتا ہے دیکھ چراغ

اوڑھنا ہے تو اوڑھ تنہائی
دیکھنا ہے تو دیکھ چراغ

میں امانت ہوں کاروانوں کی
میں ہواؤں میں ایک چراغ

ہم جو میدان میں ڈٹ جائیں گے
سارے نقشے ہی پلٹ جائیں گے

اے ہوا! اس کی گلی تک لے جا
تیرے دامن سے لپٹ جائیں گے

جس طرح دھوپ اتر جاتی ہے
ویسے سائے بھی سمٹ جائیں گے

اور آہستہ الٹنا اوراق
اتنے بوسیدہ ہیں پھٹ جائیں گے

رات شبنم سے دھلا جائے گی
دن اگر دھول سے اٹ جائیں گے

ہم سخی دست ہیں جاتے جاتے
اپنی زنبیل الٹ جائیں گے

بانٹ جائیں گے چمکنے کی ادا
چاند میں، تاروں میں بٹ جائیں گے

ہم سے کیا دل کا لگانا کاتبؔ
ہم مسافر ہیں پلٹ جائیں گے

آ کے پیچھے سے وار کر تو بھی
جا مرے دوست مار کر تو بھی

ہاتھ میں اک عصائے موسیٰ رکھ
اور سمندر کو پار کر تو بھی

حلقۂ جاوداں میں شامل ہو
خلعتِ جاں اتار کر تو بھی

تجھ کو کب سے تلاش کرتے ہیں
چھپ گیا ہے پکار کر تو بھی

اب گواہوں کی صف میں شامل ہے
جرم پر کیوں ابھار کر تو بھی

مجھ کو جب فاش تو نے کر ہی دیا
خود کو اب آشکار کر تو بھی

جیت کے جشن میں بھی شامل ہو
آخری داؤ ہار کر تو بھی

سانس لینا کھلی فضاؤں میں
حبس بے جا گزار کر تو بھی

بزمِ وحشت سجائی ہے آجا
کوئی بہروپ دھار کر تو بھی

خزاں کے رنگ گہرے ہو گئے ہیں
ہرے تھے ہم، رو پہلے ہو گئے ہیں

مری آواز اونچی ہو رہی ہے
مرے احباب بہرے ہو گئے ہیں

زمیں کی نبض نیلی ہو گئی ہے
ہوا کے ہاتھ میلے ہو گئے ہیں

کہا تھا ہم نے واپس لوٹ آنا
مگر وہ تو وہیں کے ہو گئے ہیں

وہ جن کی دید سے روشن تھیں آنکھیں
کہیں غائب وہ چہرے ہو گئے ہیں

ہمیں اپنے الاؤ جھونک دینا
بہت میلے کچیلے ہوگئے ہیں

کوئی ترکِ تعلق کا بہانہ
مراسم پھر سے گہرے ہوگئے ہیں

ہمیں اڑنے سے روکا جا رہا ہے
ہواؤں پر بھی پہرے ہوگئے ہیں

کسی رازداں کی معیت طلب تھے
اشارے کسی کے وضاحت طلب تھے

مریدی صفوں میں بڑی عافیت تھی
ولایت کے رتبے مشقت طلب تھے

ہمیں راس آئی نہ خلوت نشینی
ازل سے ہی ہم جیسے صحبت طلب تھے

کہاں تک کسی کی نگہداشت کرتے
سبھی گل عذاراں حفاظت طلب تھے

ادھر آن پہنچے تھے دشمن گھروں تک
اِدھر یہ محافظ کہ رخصت طلب تھے

تعلق کو درکار تھی گرم جوشی
رفاقت کے لہجے، تمازت طلب تھے

پھر اپنی زمینوں کو لوٹ آنے والے
مہاجر تھے ہم، اور نصرت طلب تھے

بجز جنسِ جاں اور کیا نذر کرتے
وفا کے تقاضے سخاوت طلب تھے

کوئی دیوار ہی باقی ہے نہ در ہے باقی
پھر بھی کیوں مجھ کو لگے ہے مرا گھر ہے باقی

ایک آواز، سنو، کوئی بلائے جیسے
کوئی دیوارِ شکستہ کے ادھر ہے باقی

اور کچھ دیر شبستاں کو سجائے رکھنا
لوٹ آؤنگا میں، تھوڑا سا سفر ہے باقی

میری دیوار پہ آتے ہیں ابھی تک پتھر
میری شاخوں پہ ابھی کوئی ثمر ہے باقی

عارضی جیت پہ نازاں نہ ہو، دشمن سے کہو
آخری معرکۂ فتح و ظفر ہے باقی

سب جنوں پیشہ تو صحرا سے نکل آئے تھے
پر یہ سنتے ہیں کوئی خاک بسر ہے باقی

اب بھی رہ رہ کے چمک اٹھتا ہے سارا منظر
بجھ گئی آگ مگر رقصِ شرر ہے باقی

خزاں جا رہی ہے اداسی سمیٹے
بہار آئے گی زندگانی سمیٹے

فرشتے مرے سامنے جھک گئے تھے
میں پہنچا تھا جب خاکساری سمیٹے

مرے پیچھے رہ جائے گا نور ہی نور
چلا جاؤں گا میں سیاہی سمیٹے

مجھے دیکھنا، اب بھی محوِ سفر ہوں
کئی منزلوں کی اداسی سمیٹے

پسِ پردہ کیا کیا ہوا تھا، سنو تو
میں آیا ہوں ساری کہانی سمیٹے

ہمیں اس کنارے بلایا گیا ہے
سمندر سے کہدو کہ پانی سمیٹے

میں کاتب ہوں دیکھو اسی خانداں کی
میں لایا ہوں برکت پرانی سمیٹے

دربارِ محبت کے احکام سناتے ہیں
تجدیدِ مراسم کے پیغام سناتے ہیں

کچھ دشت نصیبوں کے قصے ہیں ہمیں ازبر
ہم آبلہ پا جن کو ہر گام سناتے ہیں

مشہور کئی باتیں اوروں سے سنی ہونگی
ہم تم کو مگر قصے گمنام سناتے ہیں

تھک جائیں ٹھہر جائیں، تب پیار بھرے نغمے
ہم دشت نوردوں کو گلفام سناتے ہیں

اس قحط کے موسم میں کیا اس سے گلہ کرنا
برسائے تھے جو ہم پر انعام سناتے ہیں

اشعار سمجھ کر تم سنتے ہو تو سن لینا
ہم پر جو اترتے ہیں الہام سناتے ہیں

کچھ راز بھری باتیں، کچھ درد بھرے قصے
کچھ سوختہ جانوں کے انجام سناتے ہیں

ہے کتنی فصیلوں کو سر کرنا ابھی باقی
ہیں کتنے محاذوں پر ناکام سناتے ہیں

ہم جانئے کب سے یوں دہلیز پہ بیٹھے ہیں
وہ جانئے کب آکر پیغام سناتے ہیں

کچھ اہلِ ہوس بیٹھے آرام سے سنتے ہیں
افسانے شرافت کے بدنام سناتے ہیں

ہم پہ الزام خواب بینی کے
خواب دیکھے تھے ہم نشینی کے

ہم نے سایہ بھی بدگماں دیکھا
کیسے موسم تھے بے یقینی کے

ہم سے پوچھو عذاب ہجرت کا
ہم ہیں پروردہ بے زمینی کے

سلطنت کیسے پارہ پارہ ہوئی
کتنے دعوے تھے جانشینی کے

اس کنارے سے ہم کو دیکھ لیا
ہم فدا تیری دور بینی کے

مرحلے کتنے جان لیوا تھے
ایک حجرے میں جاگزینی کے

میں جو سجدے سے سر اٹھاؤنگا
عکس جھلکیں گے مہ جبینی کے

مجھ پہ وارد ہوئے ہیں سارے رمز
عشق کی رنگ آفرینی کے

اپنی پوشاک بدلنے کے لئے آئے ہیں
ہم تری آگ میں جلنے کے لئے آئے ہیں

کون کہتا ہے سنبھلنے کے لئے آئے ہیں
ہم تو سرکار مچلنے کے لئے آئے ہیں

ہم کہیں اور سے آئے ہیں یہاں پر ویسے
اور یاں سے بھی نکلنے کے لئے آئے ہیں

وادیٔ گل کا پتہ پوچھتے آئے ہیں یہاں
اور یہاں پھولنے پھلنے کے لئے آئے ہیں

رات بھر کے لئے مل جائے ٹھکانہ ہم کو
خواب ہیں آنکھ میں پلنے کے لئے آئے ہیں

آج کی رات الاؤ کے مقابل ہونگے
آج کی رات پگھلنے کے لئے آئے ہیں

ہے خبر گرم کہ کچھ سر پھرے آبی دھارے
ریگزاروں میں ابلنے کے لئے آئے ہیں

پھر کسی یاد کے آنگن کے چمکتے جگنو
میری آنکھوں میں مچلنے کے لئے آئے ہیں

صبحدم ان کی ہے دہلیز پہ حاضر ہونا
رات کی رات نکلنے کے لئے آئے ہیں

ہفت رنگ خواب ہیں آئندہ رتوں کے کاتب
جاگتی آنکھوں میں پلنے کے لئے آئے ہیں

وہ دشت دشت بھٹکتا ہے گھر نہیں آتا
ہزار بار بلاتا ہوں پر نہیں آتا

تجلیات سے پردے ہٹائے جاتے ہیں
وہ روشنی ہے کہ کچھ بھی نظر نہیں آتا

تو کیا شجر میں سرایت ہے زہر کچھ ایسا
کہ شاخِ سبز پہ کوئی ثمر نہیں آتا

ادھر کا حال سبھی لوگ اس سے پوچھیں گے
اسی لئے بھی وہ شائد ادھر نہیں آتا

دیارِ حسن کہاں اب ہجومِ شب زدگاں
سنا ہے چاند بھی اب بام پر نہیں آتا

سنو جو ڈوبے خزانوں کی کھوج میں نکلا
وہ ساحلوں کی طرف لوٹ کر نہیں آتا

کسی سے پوچھوں میں آگے کا راستہ لیکن
کوئی ادھر سے بھی آتا نظر نہیں آتا

کسی کو سناتے ہیں، من بھر گیا ہے
خزانہ لٹاتے ہیں، دھن بھر گیا ہے

چلو مرکزے کی طرف لوٹتے ہیں
خلاؤں سے سارا بدن بھر گیا ہے

حواشی کے بارے میں بھی گفتگو ہو
حوالوں سے ویسے متن بھر گیا ہے

کسی کو ڈسیں گے تو راحت ملے گی
کہیں پھٹ نہ جائے کہ پھن بھر گیا ہے

سبھی مٹھیاں بھر کے دینے کو آئے
تہی دست کا بھی کفن بھر گیا ہے

وہ کیسا نگہبان تھا جاتے جاتے
بولوں سے سارا چمن بھر گیا ہے

تجھے دیکھ کر پھر سے جینے لگا ہوں
کہ تجھ میں مرا بانکپن بھر گیا ہے

یقیناً پرندوں پہ حملہ ہوا ہے
جو اڑتے پروں سے گگن بھر گیا ہے

ابھی تک اندھیرے میں تھا شب کا آنگن
مگر نور سے دفعتاً بھر گیا ہے

ہمارا نام جڑا ہے کسی کے نام کے ساتھ
ہمارا نام بھی لینا تو احترام کے ساتھ

دعائیں ساتھ ساتھ جڑی ہیں کلام کے ساتھ
کہ ابتداء بھی کریں گے تو ہم سلام کے ساتھ

ہجوم سے بھی الگ اپنا کوئی راستہ ڈھونڈو
یہ کیا کہ بہنے لگے تم بھی ازدہام کے ساتھ

جہاں پہ رات الاؤ کے گرد ناچتی ہے
وہاں تو ہم بھی روز پہنچتے ہیں شام کے ساتھ

وہ سامنے سے ہی گزرا کسی نے کب دیکھا
سبھی تھے سر کو جھکائے ہوئے امام کے ساتھ

وہ کب مری شمشیر لے گئے خدا جانے
میں رزم گاہ میں پہنچا فقط نیام کے ساتھ

ادھر ادھر کے تماشوں میں کھو گئے سب لوگ
جلوس ویسے تو نکلا تھا تام جھام کے ساتھ

بام میں ہیں در و دیوار میں ہیں
خامیاں ساری جو معمار میں ہیں

ہم کبھی جرأت تعمیر میں تھے
اب تو بس سایۂ دیوار میں ہیں

منزلیں ڈھونڈتی ہیں اپنے نشاں
لغزشِ پائے طرحدار میں ہیں

ہم کہاں سب کو سنائی دیں گے
ہم ابھی حیرتِ اظہار میں ہیں

ہم وہاں سے بھی نکل آئے ہیں
وہ سنا ہے کہ ابھی پیار میں ہیں

جیت تو آخری منزل ہے حریف!
کیا ہوا ہم جو ابھی ہار میں ہیں

ایک اک سانس ہے اب تک گروی
ہم کہاں قضیۂ بیکار میں ہیں

جنسِ جاں بیچنے آئے ہیں مگر
مول کیا طے کریں تکرار میں ہیں

چاندنی پی کے ہم آوارۂ شب
رات رانی تری مہکار میں ہیں

تجلیات کا پھیلا جہاں ہے پوشیدہ
پسِ غبارِ نظر، کہکشاں ہے پوشیدہ

عجب طلسم ہے صوت و صدا کے میلے میں
فضا ہے نغمہ ریز مگر نغمہ خواں ہے پوشیدہ

وہیں پہ تشنہ لبو! ایڑیاں رگڑتے رہو
وہیں پہ چشمۂ آبِ رواں ہے پوشیدہ

وہ رازِ حسنِ ازل آنکھ سے نہاں ہی سہی
عیاں عیاں ہے ہر اک سو کہاں ہے پوشیدہ

کسی بھی آنکھ پہ ظاہر نہیں وہ خواب کا منظر
مکیں ہیں کھوئے ہوئے یا مکاں ہے پوشیدہ

ہزار درد چھپے میری بے زبانی میں
مرے سکوت میں اک داستاں ہے پوشیدہ

جواب دے کے مجھے شرمسار نہ کرنا
مرا سوال مرے مہرباں ہے پوشیدہ

ہزار سمت کا دریا ابلتا رہتا ہے
یہ دل ہمیشہ گلے میں اچھلتا رہتا ہے

ادھر وہ جادو تماشہ کہ چلتا رہتا ہے
ادھر یہ طفلکِ ناداں مچلتا رہتا ہے

ابھی سیاہ، ابھی قرمزی، ابھی دھانی
وہ رنگ ریز بھی کیا کیا بدلتا رہتا ہے

وہ دشت ہو کہ سمندر، کہ وادیاں کہسار
یہ ہجر زاد سہولت سے چلتا رہتا ہے

کبھی یہ منظرِ حیراں بھی دیکھنا آکر
کہ اک چراغ میں محراب جلتا رہتا ہے

وہ برف زار بظاہر تو منجمد ہے مگر
قریب جاؤ تو کیسا پگھلتا رہتا ہے

وہ دھوپ چھاؤں کی صورت مرا ہمزاد
سفر حضر میں مرے ساتھ چلتا رہتا ہے

خاک میں آ، مری پوشاک میں آ
تو مرے خس مری خاشاک میں آ

بے بسی مجھ کو نہ پاگل کردے
آ کبھی حیطۂ ادراک میں آ

پھولنے پھلنے کے موسم آئیں
ساعتِ سبز مری خاک میں آ

عیب ہے تُو مرا، پوشیدہ ہی رہ
کس نے بولا تھا مری ساکھ میں آ

احتجاجاً تو کبھی چیخ میں ڈھل
اور کبھی لہجۂ بے باک میں آ

میرے شعلوں کو ہوا دے پھر سے
جل بجھا ہوں تو مری راکھ میں آ

اتنا رو، ساری کثافت ڈھل جائے
پاک ہو جائے تو افلاک میں آ

نشانیاں تو وہی ہیں ضرور تھا پہلے
یہیں کہیں پہ وہ دارالسرور تھا پہلے

ترے جمال کے صدقے میں جگمگا اٹھا
مرے وجود میں کب ایسا نور تھا پہلے

وہ دن بھی کیا تھے کہ تحریر بھی مؤدب تھی
اور التماس بھی بین السطور تھا پہلے

یہ اور بات کہ اب اعتبار کھو بیٹھے
ہمارا نام کسی کا غرور تھا پہلے

تری تلاش میں اپنا سراغ پایا ہے
میں اپنے آپ سے بھی کتنا دور تھا پہلے

یہاں تو آگ ہے، پانی ہے آسمان بھی ہے
یہاں کوئی نہ کوئی تو ضرور تھا پہلے

کہاں کہ سامنے تیرے میں بوکھلا ہی گیا
کہاں یہ زعم، زباں پر عبور تھا پہلے

ازل ابد کے کناروں میں رنگ بھرتے ہوئے
وہ نقش نقش سنورتے ہوئے نکھرتے ہوئے

نظر اٹھاتا تو شاید میں راکھ ہوجاتا
میں سر جھکائے رہا اس سے بات کرتے ہوئے

تو اک ندی کی طرح دشت میں سنورتی ہوئی
میں ابر پارہ صفت ٹوٹتے بکھرتے ہوئے

بہت رسان سے اس نے ہمیں جواب دیا
سوال ویسے تو پوچھا تھا ہم نے ڈرتے ہوئے

وہاں تو کچھ بھی نہیں خاکِ نقشِ پا کے سوا
کسی کو دیکھا تھا ہم نے وہاں اترتے ہوئے

میں ڈرتا رہتا ہوں پتھرا کے رہ نہ جاؤں کہیں
طلسم خانۂ حیرت سے یوں گزرتے ہوئے

کہ کس کے ہاتھ مجھے تھامنے کو بڑھتے ہیں
مجھے یہ دیکھنا تھا ڈوبتے ابھرتے ہوئے

وہ بھی تکتا ہی رہا اس نے کہا کچھ بھی نہیں
میں بھی سکتے میں رہا میں نے سنا کچھ بھی نہیں

اب تو شب خوں کا بھی خدشہ نہیں، کیا جاگتے رہنا
سب کا سب لوٹ لیا، اب تو بچا کچھ بھی نہیں

تیرا ٹھہرایا ہوا حرفِ قضا ہی سب کچھ
یہ مری لرزشِ لب، دستِ دعا، کچھ بھی نہیں ؟

کیسی سرکار ہے یاں باغی ہیں یکسر آزاد
کیا یہاں حکم عدولی کی سزا کچھ بھی نہیں

قتل و خوں روز کا معمول ہے کیوں؟
کوئی قاتل کی سزا، خون بہا کچھ بھی نہیں

چل کہیں اور ادا کرتے ہیں رسمِ ہجرت
یاں بجز ریگِ رواں، رقصِ ہوا کچھ بھی نہیں

جشن کی رات سنا خوب چراغاں ہوگا
جشن کی رات مگر ایسا ہوا کچھ بھی نہیں

لہلہاتا ہوا آنکھوں میں سہانا منظر
کوئی رس گھولتی کانوں میں صدا کچھ بھی نہیں

لوٹ چلتے ہیں چلو اپنے پرانے گلشن
یاں کوئی پھول، نہ خوشبو نہ صبا، کچھ بھی نہیں

ہر طرف سے دباؤ جیسا تھا
تیری جانب جھکاؤ جیسا تھا

جل رہے تھے ہزاروں پروانے
بیچ میں اک الاؤ جیسا تھا

اشک جھر جھر جہاں سے بہتے تھے
باندھ میں اک کٹاؤ جیسا تھا

اب کے اس کا سبھاؤ میرے سنگ
دشمنوں کے سبھاؤ جیسا تھا

نغمے بیتاب تھے مچلنے کو
تارِ جاں میں تناؤ جیسا تھا

بات کیسے نہ مانتے اس کی
اس کے لہجے میں چاؤ جیسا تھا

ٹیس اٹھتی تھی رہ رہ کے
ہم نے دیکھا تو گھاؤ جیسا تھا

منزل بھی کیا، پڑاؤ بھی کیا، راستے بھی کیا
اک بار چل پڑے ہیں تو یہ مرحلے بھی کیا

دیکھو تو عرضِ حال کے یہ سلسلے بھی کیا
آہ و فغاں بھی کیا یہ مرے رتجگے بھی کیا

تفصیل سے ہمیں بھی بتایا گیا کہاں
ہم محرمانِ راز، مگر پوچھتے بھی کیا

آنکھوں میں جیسے تابِ تماشہ نہیں رہی
حیرت کدہ کھلا تھا مگر دیکھتے بھی کیا

شہرِ وفا سے شہر بدر کر دئے گئے
ہم وارثانِ درد تھے اتنے برے بھی کیا

آندھی اڑا کے لے گئی کیا رونقِ چمن
زردا گئے ہیں دھوپ میں اب کے ہرے بھی کیا

گردِ ملال چھائی ہوئی تھی طرف طرف
اک ساعتِ زوال میں ہم ڈھونڈتے بھی کیا

ابر پاروں سے کہو، کوئی نشانی لکھ دیں
ریگزاروں پہ برستا ہوا پانی لکھ دیں

سرخ کو سبز کہیں، زرد کو دھانی لکھ دیں
ہم بدلتے ہوئے رنگوں کی کہانی لکھ دیں

کوچ کرنے کے چلو خیر سے موسم آئے
اس پڑاوَ پہ بھی ہم نقل مکانی لکھ دیں

ہر نظارے پہ کریں نقش تحیر اپنا
ہر اک دیوار پہ آشفتہ بیانی لکھ دیں

افقِ سادہ کو رنگوں سے مزین کرکے
ان ہواؤں پہ چلو رات کی رانی لکھ دیں

ہم نے دیکھا تو تعفن سے بھرا تھا تالاب
جی یہ کرتا تھا کہ پانی پہ روانی لکھ دیں

رات دن ٹوکتے رہنا ہے فریضہ اس کا
آؤ ہمزاد کو بھی دشمنِ جانی لکھ دیں

آنا جانا لگا تو رہتا ہے
اس طرف راستہ تو رہتا ہے

کوئی صورت نکال ہی لیں گے
ہاں ادھر جمگھٹا تو رہتا ہے

پاس آتا نہیں، بلاتا نہیں
وہ مجھے دیکھتا تو رہتا ہے

سلسلہ ایک ٹوٹ جائے تو
دوسرا سلسلہ تو رہتا ہے

وہ مرے ساتھ تو نہیں رہتا
ہاں مگر آسرا تو رہتاہ ے

اس کی شاخوں پہ پھل نہیں آتے
اس کا سایہ ہرا تو رہتا ہے

ہم پذیرائی کو سدا حاضر
حجلۂ جاں سجا تو رہتا ہے

کیا مقدر ہے ٹھہرے پانی کا
حکم آتا نہیں روانی کا

ساعتِ سبز، منبعِ انوار
کوئی عنواں مری کہانی کا

کوئی پتھر اچھال کر دیکھو
شور ہوگا تو ہوگا پانی کا

شور کرتا وجودِ فانی میں
ایک سناٹا لامکانی کا

محل تھا ایک، دو تھے شہزادے
ایک راجہ کا ایک رانی کا

ساحلوں ساحلوں گزر جائیں
کوئی موسم تو ہو روانی کا

بزمِ صورت گراں میں چرچا تھا
ایک تصویر رائیگانی کا

نیزہ نیزہ ابھر کے دیکھ لیا
ایک دھوکہ تھا کامرانی کا

ساحلوں پر بچا نہیں کچھ بھی
بس نشاں رہ گیا ہے پانی کا

تمھارے حکم کی تعمیل کرنے آؤنگا
میں اپنے آپ کی تکمیل کرنے آؤنگا

یہ جذب و مستی کے بس آخری مراحل ہیں
میں لفظ و معنٰی کی ترسیل کرنے آؤنگا

سنا دھرے کے دھرے ہیں تمام منصوبے
نئے سرے سے میں تشکیل کرنے آؤنگا

کوئی کمی تو ہے صوت و صدا کی محفل میں
حروفِ خفتہ کی ترسیل کرنے آؤنگا

ہنوز دھند میں ڈوبے ہوئے ہیں افسانے
روایتوں کی میں تاویل کرنے آؤنگا

مسافرت ہے بری نور کی معیت میں
میں اپنی خاک کو تحلیل کرنے آؤنگا

دیدنی ہے ابال پانی کا
آنکھ تک ہے اچھال پانی کا

جا کے صحرا میں غرق ہونا تھا
وائے عبرت! زوال پانی کا

پانیوں میں گندھی ہوئی خوشبو
پھول پانی کے تھال پانی کا

آنکھ سے آسمان تک دیکھو
کیسا پھیلا ہے جال پانی کا

پانی پانی ہے انفصال کی حد
نقطۂ اتصال پانی کا

پل کی پل بھر گئیں آنکھیں
تم نے پوچھا تھا حال پانی کا

بستیاں زیرِ آب دیکھی ہیں
دیکھنا تھا وبال پانی کا

میرے حجرے میں جھانک کر دیکھو
آخرِ شب دھمال پانی کا

ساری خلقت اُمڈ کے آئی ہے
آگ سے ہے وصال پانی کا

ہم تماشہ سرِ بازار نہ کرنے پائے
مول ایسا تھا کہ تکرار نہ کرنے پائے

انہدامِ در و دیوار نہ کرنے پائے
اور بھی گھر کو ہوادار نہ کرنے پائے

اب سمیٹیں گے یہاں سے بھی پڑاؤ اپنا
اس خرابے کو بھی گلزار نہ کرنے پائے

یہ بھی ممکن تھا کہ جاں بخش دی جاتی اپنی
پر تقاضہ بھی لگاتار نہ کرنے پائے

عنکبوتی ہیں سبھی راہ میں بیٹھے سائے
دیکھنا کوئی گرفتار نہ کرنے پائے

جسم وجاں بیچ دیۓ تیری خوشی کی خاطر
ایسا لہجہ تھا کہ انکار نہ کرنے پائے

ہم سمجھتے ہیں شجاعت کے تقاضے کاتب
وہ نہتا تھا مگر وار نہ کرنے پائے

خاک ہوں، نور سے رشتہ میرا
دیکھ تو، حور سے رشتہ میرا

پاس آتے ہوئے رک جاتا ہوں
دور ہی دور سے رشتہ میرا

بے کرانی ہے وراثت میری
پرِ عصفور سے رشتہ میرا

سارے نوری ہیں مرے ہمسائے
بیتِ معمور سے رشتہ میرا

نیک نامی کی ضمانت ٹھہرا
ایک مشہور سے رشتہ میرا

جلتا جاؤں، میں مہکتا جاؤں
عود و کافور سے رشتہ میرا

بازیابی کی دعائیں مانگوں
کیا ہے مفرور سے رشتہ میرا

قرار مانگوں، ترا لطفِ دائمی مانگوں
میں ہاتھ اٹھا کے تجھے آج تجھ سے ہی مانگوں

ہو قدسیوں میں عطا پھر مقامِ محبوبی
وہی فراز وہی اوجِ بندگی مانگوں

یہ کاروبارِ محبت بڑا ہی نازک ہے
وفا شعار رہوں، اور دوستی مانگوں

پھر اس کے بعد عطا نور کے سویرے ہوں
بس ابتداء کے لئے تھوڑی روشنی مانگوں

سنا ہے آج تو نزدیک ہوگا بندوں سے
میں سر بسجدہ ترا قرب دائمی مانگوں

بس ایک بار تجھے مانگ لوں میں تجھ سے ہی
قسم تری جو کبھی اس کے بعد بھی مانگوں

اے گوہرِ مراد! تری جستجو میں تھا
میں ڈوبتا ابھرتا کسی آبجو میں تھا

آتش فشاں سا پھوٹ پڑا لمسِ تیغ پر
کیا جانئے کہاں کا تلاطم لہو میں تھا

ہر گام پر ملے مجھے اس کے نقوشِ پا
کوئی ضرور تھا جو مری جستجو میں تھا

کل رات میرے ساتھ تھا کوئی ستارہ زاد
اک رنگ آسمان کا چھایا لہو میں تھا

ہر انجمن میں ہم ہی سخن در سخن رہے
تیرا مرا حوالہ ہر اک گفتگو میں تھا

ڈوبا تو موج موج کو گلنار کر گیا
اک پرتوِ جلال ترے سرخ رو میں تھا

تو ہی تو مرکزہ تھا مرے جذب و شوق کا
میرا ہی انتشار ترے چار سو میں

ہم ترے عشق میں کامل بھی نہ تھے
پر کسی اور کے قائل بھی نہ تھے

ہاں کبھی پھول بچھائے بھی نہیں
پر تری راہ میں حائل بھی نہ تھے

کیوں تعاقب میں تھی اک موجِ بلا
ہم تو آسودۂ ساحل بھی نہ تھے

تم نے بھی کر دیا کیوں ترکِ محاذ
تم تو دشمن کے مقابل بھی نہ تھے

ہم ہی ٹھہرائے گئے موردِ الزام
ہم تو اس جرم میں شامل بھی نہ تھے

دور کے ڈھول سہانے نکلے
جھیل کے پار عنادل بھی نہ تھے

اپنی آہستہ روی نے مارا
فاصلے عشق کے مشکل بھی نہ تھے

اک روز پلٹنے کا امکان اٹھا لائے
سب کچھ تو وہیں چھوڑا، بس جان اٹھا لائے

انبوہِ خلائق میں ہر جنس میسر تھی
ہم اپنے علاقے میں انسان اٹھا لائے

کیا جانئے کس ساعت کس چیز کی حاجت ہو
یہ سوچ کے ہم ساری دکان اٹھا لائے

اب اہلِ خرد بیٹھے تفتیش یہ کرتے ہیں
دامن میں چھپا کر کیا نادان اٹھا لائے

گنجان علاقے کو اوروں نے فضیلت دی
ہم اپنی رہائش کو سنسان اٹھا لائے

دیدار کی حسرت میں سب کچھ تو گنوا بیٹھے
اک آنکھ بچی تھی سو حیران اٹھا لائے

ستارے ٹانک جائینگے، سبھی مہتاب رکھ دیں گے
تمہاری رات میں ہم اپنے سارے خواب رکھ دیں گے

دمکتے ساحلوں پر گوہرِ نایاب رکھ دیں گے
سبھی دریا تمہارے واسطے پایاب رکھ دیں گے

اتاریں گے اڈتے پانیوں میں بھی کوئی ساحل
سلگتی سرزمینوں پر کوئی سیلاب رکھ دیں گے

جدھر بھی جاؤ گے، منزل تمھارے پاؤں چومے گی
بہر جادہ رسائی کے سبھی اسباب رکھ دیں گے

اتر جائیں گے اپنی تیرہ و تاریک پستی میں
دیا کوئی نشانی کو سرِ محراب رکھ دیں گے

ہیں سب گوشہ نشینانِ فلک خائف اندھیرے سے
زمیں سے کوئی لے جا کر وہاں مہتاب رکھ دیں گے

اب دلِ زار کا کرنا کیا ہے
ایک بیمار کا کرنا کیا ہے

ایک قطرے میں یہاں غرق ہوئے
موسلا دھار کا کرنا کیا ہے

جس کی چھاؤں بھی میسر نہ رہی
ایسی دیوار کا کرنا کیا ہے

بس جلا دینی ہے قندیل کوئی
تیرہ و تار کا کرنا کیا ہے

جنسِ بازار ہوئی ہے عنقا
اب خریدار کا کرنا کیا ہے

رائج الوقت نہیں یہ سکے
ایسے اشعار کا کرنا کیا ہے

کاٹ دینا ہے، جلا دینا ہے
سبز اشجار کا کرنا کیا ہے

گردابِ تمنا سے الجھنا بھی نہیں ہے
اس بحر کے اس پار اترنا بھی نہیں ہے

مانا کہ ہیں محبوس سبھی عالمِ امکاں
کیا شعلۂ تحقیق کو جلنا بھی نہیں ہے؟

جب تک کہ ترا حکمِ روانی نہیں آتا
رکنا بھی نہیں ہے ہمیں بہنا بھی نہیں ہے

اب وقت ہے دیواروں پہ تحریر کریں گے
اب راز چھپا کر کوئی رکھنا بھی نہیں ہے

یونہی چلے جانا ہے کیا کوہ کے اس پار
اے ابرِ رواں! اب کے برسنا بھی نہیں ہے؟

یہ عالمِ سکرات ہے اے شعلۂ کم ظرف
بجھنا بھی نہیں ہے کہ یہ جلنا بھی نہیں ہے

واپس چلا جانا ہے کسی روز سنبھل کر
اس عالمِ مدہوش میں رہنا بھی نہیں ہے

اب جوشِ جنوں رقص پہ مجبور کرے ہے
پر حکم ہوا ہے کہ بہکنا بھی نہیں ہے

اک عمر گزاری ہے حراست کے برابر
تفتیش تو ہونی تھی شکایت کے برابر

یہ عالمِ خاکی ہے کہاں کافی و شافی
وسعت بھی عطا کر مجھے وحشت کے برابر

نیندوں میں مخل ہوتی ہیں یہ کس کی صدائیں
شاید کوئی رہتا ہے مری چھت کے برابر

سرگرداں ہیں اب تک بھی فقیرانِ صداقت
رتبہ کوئی پایا نہ ولایت کے برابر

یہ خلدِ بریں مفت میں پائی نہیں یارو
محنت بھی تو کرنی پڑی اجرت کے برابر

پھولوں میں کہاں ہے ترے انفاس کی خوشبو
شمشاد کہاں ہے تری قامت کے برابر

میں پلکیں بچھائے ہوئے بیٹھا ہی رہوں گا
تم جب بھی چلے آؤ سہولت کے برابر

ساتھ وہ آخرِ شب تک رہتا
چاند رہتا بھی تو کب تک رہتا

یا چلا آتا وہاں سے اٹھ کر
یا وہیں عرضِ طلب تک رہتا

ایک دن مجھ کو نمودار تھا ہونا
میں نہاں خانے میں کب تک رہتا

ایسے محفل میں نہ ہوتے بدنام
مدعا لرزشِ لب تک رہتا

اس پہ کھل جاتے جنوں کے اسرار
وہ اگر شور و شغب تک رہتا

پیش قدمی کی دعائیں دیتا
اک نگہبان عقب تک رہتا

پہلی فرصت میں نکل آنا تھا
میں وہاں رہتا تو اب تک رہتا

اس سے آگے کا مجھے علم نہ تھا
کاش وہ نام و نسب تک رہتا

طشت از بام نہ ہوتا کاتبؔ
راز وہ مہر بلب تک رہتا

شکست خوردہ قبیلے کا ترجمان ہوں میں
گذشتہ جنگ سے اب تک لہولہان ہوں میں

میں کب سے بول رہا ہوں بھٹکتی روحوں سے
یہاں قیام کرو، آخری مکان ہوں میں

ابل ابل کے میں ہر سمت پھیل جاؤں گا
بہت دنوں سے کناروں کے درمیان ہوں میں

ریاستیں تو کبھی کی خیال و خواب ہوئیں
نمائشی ہی سہی، اب بھی حکمران ہوں میں

ابھرتی ڈوبتی لہروں میں ڈھونڈنا مجھ کو
جہاں سے پار ہے کرنا، وہیں نشان ہوں میں

خدا کرے کہ تمہارا یقین بن جاؤں
ابھی ہوں وہم کی صورت، ابھی گمان ہوں میں

نہ عطر بیز ہوائیں نہ آگ کے شعلے
مجھے تو ایسا لگے ہے کہ درمیان ہوں میں

اگر زبان میں کھولوں تو سب کی پول کھل جائے
مغالطے میں نہ رہنا کہ بے زبان ہوں میں

میں لفظ لفظ ہوں قرطاسِ وقت پر لکھا
مجھے پڑھو کہ تمھاری ہی داستان ہوں میں

سارے وعدوں سے مکر جانا تھا
دل نے اک روز تو بھر جانا تھا

بحر سے اٹھ کے ہوا کے ہمراہ
ہم کو صحرا میں بکھر جانا تھا

راہ پرخار تھی اور آبلہ پا
جا نہ سکتے تھے مگر جانا تھا

یہ کہاں آگئے بہتے بہتے
جس طرف تو ہے ادھر جانا تھا

وادئ نور میں رکنا تھا ہمیں
خیمۂ گل میں ٹھہر جانا تھا

اب یہاں آ کے بھی کرنا کیا ہے
تیری چوکھٹ ہی پہ مر جانا تھا

ٹکٹکی باندھ رکھی ہے تجھ پر
میری آنکھوں کو تو بھر جانا تھا

رقص کرنا تھا بھنور کے ہمراہ
اور پاتال اتر جانا تھا

چاند بھی جاگتا رہتا کب تک
ہم کو بھی لوٹ کے گھر جانا تھا

جنسِ بازار کو بازار میں رکھا ہوتا
خود کو بھی چشمِ خریدار میں رکھا ہوتا

کوئی ہمدرد کبھی تم کو بچانے آتا
کوئی دروازہ تو دیوار میں رکھا ہوتا

اس طرف جاتے تو پھولوں کی زیارت کرتے
راستہ خطۂ پر خار میں رکھا ہوتا

تری نظروں نے مجھے مول لیا تھا ورنہ
میں ابھی تک وہیں بازار میں رکھا ہوتا

ہم فقط اپنا بچاؤ ہی نہ کرتے رہتے
کاش اک وار بھی تلوار میں رکھا ہوتا

شوقِ دیدار کے مارے تھے، دعائیں دیتے
کبھی اقرار بھی انکار میں رکھا ہوتا

یوں وفاؤں کی دہائی تو نہ دیتے رہتے
صبر بھی تھوڑا وفادار میں رکھا ہوتا

سوزشِ جاں بھی تو اظہار میں رکھی ہوتی
پارۂ دل بھی تو شہکار میں رکھا ہوتا

پیشگوئی. ترے انجام کی کرتا رہتا
اک نجومی کو بھی دربار میں رکھا ہوتا

سار‌ی روداد سنانے لگ جائیں
آ شبِ غم ترے شانے لگ جائیں

ان کے آنے کی خبر آئی ہے
چل در و بام سجانے لگ جائیں

کچھ وہاں سوچ سمجھ کر جانا
یہ نہ ہو روگ پرانے لگ جائیں

اب کے جاتے ہیں تو آتے آتے
عین ممکن ہے زمانے لگ جائیں

ہم ترے شہر سے گزریں بھی اگر
کتنے الزام نجانے لگ جائیں

باپ کا قرض تو سر سے اترے
سارے بچے جو کمانے لگ جائیں

ڈوب جائیں کہ اس پار لگیں
ہم کسی طور ٹھکانے لگ جائیں

قیمتی ویسے نہی ہیں کاتبؔ
پر خریدو تو خزانے لگ جائیں

ہر مبارک سے سلامت سے گذر جاؤں گا
شہرِ دلدار محبت سے گذر جاؤں گا

موسلا دھار برستی رہے رحمت تیری
شعلہ زاروں سے سہولت سے گذر جاؤں گا

صاف و شفاف فضاؤں میں ہو میری پرواز
ہر ثقالت سے، کثافت سے گذر جاؤں گا

ایک انبوہِ سگاں میرے تعاقب میں ہے
پھر بھی بچتا ہوا سرعت سے گذر جاؤں گا

اور طے کرنے ہیں کتنے ہی مقاماتِ جنوں
آج میں خلوت و جلوت سے گذر جاؤں گا

پہلے آنے تو دے مجھکو تری دہلیز تلک
پھر میں تیری ہی اجازت سے گذر جاؤں گا

ایک پر ہول بیابان ڈراتا ہے مجھے
تو صدا دے تو حفاظت سے گذر جاؤں گا

آخری بار گزرنا ہے مجھے شعلوں سے
آخری بار بھی راحت سے گذر جاؤں گا

بھرا ہوا وہاں کپاس تھا بہت
وہ جل گیا جو آس پاس تھا بہت

وہ خوبرو تھا، خوش لباس تھا بہت
وہ میرے دوستوں میں خاص تھا بہت

ہنسی خوشی وہاں سے آ گیا مگر
وہاں سے آ کے وہ اداس تھا بہت

میں آنسوؤں کے راستے نکل گیا
حصارِ جاں میں جب ہراس تھا بہت

اسے اجالے راس آ گئے مگر
وہ شب نژاد ناسپاس تھا بہت

طوالتوں کو ہم کہاں سہارتے
ہمیں تو ایک اقتباس تھا بہت

ہم سے زخموں کی نمائش نہیں ہونے والی
چارہ سازی کی گذارش نہیں ہونے والی

رات بھر کوئی الاؤ نہیں جلنے والا
صبح دم کوئی تراوش نہیں ہونے والی

اب کوئی ابر نہ کہساروں پہ چھانے والا
اب کے صحراؤں پہ بارش نہیں ہونے والی

میری درخواست بھی رد کر دیں وہ بیشک، مجھ سے
اور بھی ان سے گذارش نہیں ہونے والی

اب تو دشمن نے ہٹالی ہے فصیلوں سے سپاہ
پھر بھی ہم سے کوئی یورش نہیں ہونے والی

اب کوئی غار بچا ہے نہ کمیں گاہ کوئی
اب کہیں سے کوئی سازش نہیں ہونے والی

شہر پر کیا یونہی کابوس مسلط ہوگا؟
اب یہاں کیا کوئی جنبش نہیں ہونے والی؟

تو بلالے ہمیں واپس، یہ قسم کھاتے ہیں
ہم سے پھر کوئی بھی لغزش نہیں ہونے والی

اب رہیگا یہ عمر بھر دل میں
درد نے کرلیا ہے گھر دل میں

کیوں گریزاں ہے موج کی مانند
قطرہ قطرہ سہی، اتر دل میں

اب بھی تیرے وصال کی خواہش
چھپ کے رہتی ہے سر بسر دل میں

جانے کیا کیا خیال آتے ہیں
تجھ کو دیکھوں تو دیکھ کر دل میں

تو نہیں تھا تو کون آیا تھا؟
کون دھڑکا تھا رات بھر دل میں

خالی گھر میں بلائیں رہتی ہیں
کچھ تو لا، لا کے بھر دل میں

حصہ مرے مکان کا مجھ کو بھی چاہیے
ایک گوشہ آسمان کا مجھ کو بھی چاہیے

تم کو بھی چاہیے تو چلو بانٹ لیتے ہیں
سایہ تو سائبان کا مجھ کو بھی چاہیے

مجھ کو بھی دیکھنا ہے کہاں ہے مرا مکان
نقشہ ترے جہان کا مجھ کو بھی چاہیے

ہلکان ہو رہا ہوں میں تیرے فراق میں
ہرجانہ میری جان کا مجھ کو بھی چاہیے

کب تک میں بھیڑیوں سے ہراساں پھرا کروں
اب آسرا مچان کا مجھ کو بھی چاہیے

ٹوٹا تارا بھی ہم نے دیکھ لیا
یہ اشارا بھی ہم نے دیکھ لیا

اک جھلک سے مٹی نہ حسرتِ دید
سو دوبارا بھی ہم نے دیکھ لیا

پیش قدمی میں کامیابی ہے
استخارا بھی ہم نے دیکھ لیا

اور کیا دیکھنا ہے باقی دلا؟
پارا پارا بھی ہم نے دیکھ لیا

سیر چشمی کہاں نصیب میں تھی
یہ نظارا بھی ہم نے دیکھ لیا

جو نہاں ہے اسے بھی دیکھنا ہے
آشکارا بھی ہم نے دیکھ لیا

اس میں شامل نہیں غزل اپنی
یہ شمارہ بھی ہم نے دیکھ لیا

گہن کی رات کوئی سدِ راہ تھا شائد
تبھی تو چاند کا چہرہ سیاہ تھا شائد

قدم قدم پہ مجھے ہوشیار کرتا تھا
مرا عدو ہی مرا خیر خواہ تھا شائد

سنا ہے میری سزا اور بھی بڑھادی گئی
مرے خلاف مرا ہی گواہ تھا شائد

اک ارتعاش سے سارا طلسم ٹوٹ گیا
وہ پانیوں میں کوئی عکسِ ماہ تھا شائد

اطاعتوں سے کہاں سر فراز ہوئے
مرا نجات دہندہ مرا گناہ تھا شائد

جو قید ہو گئے سارے تھے اس کے درباری
وہ سر جھکائے ہوئے بادشاہ تھا شائد

مجھے عطا ہوا اعراف کا مقام حنیفؔ
مرے گناہ میں بھی اشتباہ تھا شائد

ہم آسماں سے یونہی اتارے نہیں گئے
کچھ راز ایسے بھی تھے جو سمجھے نہیں گئے

سچ ہے جنوں میں تم بھی عدیم المثال تھے
ہم ایسے سر پھرے بھی تو دیکھے نہیں گئے

مانا کہ تم نے حد سے تجاوز نہیں کیا
ہم بھی تو ان حدود سے آگے نہیں گئے

صدیوں سے اپنا ملبہ ہے یونہی پڑا ہوا
بکھرے ہیں ایسے ہم کہ سمیٹے نہیں گئے

رحم و کرم پہ یونہی سمندر کے کب سے ہیں
ہم کب سے ساحلوں پہ اتارے نہیں گئے

محضر میں میرے ساتھ بہت سوں کے نام تھے
کچھ نام وہ بھی تھے جو پکارے نہیں گئے

اس نے بھی محفلوں میں بلایا نہیں ہمیں
کچھ ہم بھی احتیاط کے مارے نہیں گئے

سفر اب آبلوں تک آ گیا ہے
یہ صحرا پانیوں تک آ گیا ہے

سفینہ ساحلوں تک آ گیا ہے
نئی آبادیوں تک آ گیا ہے

گریباں میں چھپا رکھا تھا جن کو
سوال اب ان بتوں تک آ گیا ہے

ابھی دیوار کی حاجت نہیں ہے
دفینہ وارثوں تک آ گیا ہے

کبھی جو کھیت کھلیانوں میں ہوتا تھا
وہ جھگڑا اب گھروں تک آ گیا ہے

لو خطرے کا نشاں بھی پار کر کے
لہو اب آنسوؤں تک آ گیا ہے

جو اک آسیب ویرانوں کی حد تک تھا
سنا، آبادیوں تک آ گیا ہے

صفوں سے دشمنوں کی ہٹتے ہٹتے
اشارہ دوستوں تک آ گیا ہے

برسنے میں ابھی ہے دیر ہی کتنی
کہ موسم بادلوں تک آ گیا ہے

سچ ہے کہ رازہائے جنوں منکشف بھی تھے
ہم ان ہدایتوں سے مگر منحرف بھی تھے

پامال راستوں میں جلاتے رہے چراغ
ہم قافلے کے ساتھ سہی، مختلف بھی تھے

ایسے زماں مکاں سے ہوئے بے نیاز ہم
سیرِ حریمِ ذات بھی تھی، معتکف بھی تھے

باوصفِ احتیاطِ نظر، دیکھتے رہے
اس پیکرِ جمال کے ہم معترف بھی تھے

حالانکہ اک ہجوم تھا دربارِ ناز میں
صد شکر وہ ہماری طرف منعطف بھی تھے

پھر یوں ہوا مجھے مصلوب کر دیا گیا
کچھ معتقد تو تھے مرے کچھ منحرف بھی تھے

حضورِ دیدہ وراں پیش کرتے ہیں
متاعِ کوچۂ جاں پیش کرتے ہیں

جہاں بھی جس سے بھی ملتے ہیں اہل النار
تو آگ اور دھواں پیش کرتے ہیں

حضور! کوئی خلل ہو نظر انداز
حسابِ سود و زیاں پیش کرتے ہیں

یقیں ہے تم کو یقیں راس آئے گا
نہیں تو وہم و گماں پیش کرتے ہیں

ہدف بھی تم کو کسی روز وہ بنائیں گے
جو آج تیر و کماں پیش کرتے ہیں

برائے دشت نوردانِ تنہائی
ہم ایک نغمۂ جاں پیش کرتے ہیں

اگر تو راضی نہیں اس سے کم پر تو
تری جناب میں جاں پیش کرتے ہیں

سچ ہے کہ رازہائے جنوں منکشف بھی تھے
ہم ان ہدایتوں سے مگر منحرف بھی تھے

پامال راستوں میں جلاتے رہے چراغ
ہم قافلے کے ساتھ سہی، مختلف بھی تھے

ایسے زماں مکاں سے ہوئے بے نیاز ہم
سیرِ حریمِ ذات بھی تھی، معتکف بھی تھے

باوصفِ احتیاطِ نظر، دیکھتے رہے
اس پیکرِ جمال کے ہم معترف بھی تھے

حالانکہ اک ہجوم تھا دربارِ ناز میں
صد شکر وہ ہماری طرف منعطف بھی تھے

پھر یوں ہوا مجھے مصلوب کر دیا گیا
کچھ معتقد تو تھے مرے کچھ منحرف بھی تھے

حضورِ دیدہ وراں پیش کرتے ہیں
متاعِ کوچۂ جاں پیش کرتے ہیں

جہاں بھی جس سے بھی ملتے ہیں اہل النار
تو آگ اور دھواں پیش کرتے ہیں

حضور! کوئی خلل ہو نظر انداز
حسابِ سود و زیاں پیش کرتے ہیں

یقیں ہے تم کو یقیں راس آئے گا
نہیں تو وہم و گماں پیش کرتے ہیں

ہدف بھی تم کو کسی روز وہ بنائیں گے
جو آج تیر و کماں پیش کرتے ہیں

برائے دشت نوردانِ تنہائی
ہم ایک نغمۂ جاں پیش کرتے ہیں

اگر تو راضی نہیں اس سے کم پر تو
تری جناب میں جاں پیش کرتے ہیں

جاگتا رہتا ہوں، مہتاب بہت دیکھتا ہوں
لوگ کہتے ہیں کہ میں خواب بہت دیکھتا ہوں

اپنی رسوائی کے اسباب بہت دیکھتا ہوں
اپنے اطراف میں احباب بہت دیکھتا ہوں

کوئی دریا اُمڈ آیا ہے مرے صحرا میں
ہر گلی کوچے میں سیلاب بہت دیکھتا ہوں

حاضری لگنی ہے شاید ترے دربار میں اب
آج کل سندس و کمخواب بہت دیکھتا ہوں

دوستی، مہر و وفا، عشق، جنوں اور ایثار
آج کل جنس یہ نایاب بہت دیکھتا ہوں

دیکھنا جس کو نہ چاہوں وہ ہیں کثرت سے بہم
دیکھنا ہے جسے، کمیاب بہت دیکھتا ہوں

ان دنوں تیری عنایات کا مرکز ہوں حنیف
ان دنوں خود کو میں شاداب بہت دیکھتا ہوں

کن لغزشوں کی آگ میں جلنا پڑا ہے یوں
نسلوں تلک وبال بھگتنا پڑا ہے یوں

اک بار کیا زبان پہ لکنت سی آگئی
اک عمر پھر جناب سے کہنا پڑا ہے یوں

اک ایک کرکے بہہ گئیں ساری رفاقتیں
دیوارِ اعتبار میں رخنہ پڑا ہے یوں

سوکھی ہوئی کھجور کی اک شاخ ہوگیا
اک چودھویں کے چاند کو گھٹنا پڑا ہے یوں

مانوس رہگزاروں پہ وہ حادثے ہوئے
ہم کو بھی احتیاط سے چلنا پڑا ہے یوں

ہر سمت پھیلنے کی بالآخر سزا ملی
حجرے میں دیکھو ایک سمٹنا پڑا ہے یوں

ویسے کہنے کو ہم آسماں زاد ہیں
پستیوں میں یہاں کب سے آباد ہیں

لوح و قرطاس سے رابطہ ہے وہی
ہم وہی صاحبِ علم و ارشاد ہیں

منحصر ہے اگر فتح اعداد پر
اپنے ہمراہ بھی کافی افراد ہیں

ایک بے سمت صحرا میں محبوس جیسے
ہم یہاں قید ہیں اور نہ آزاد ہیں

کچھ تو تفریح کا اپنی سامان ہو
دل گرفتہ ہیں ہم اور ناشاد ہیں

اس کی لہروں سے ہے آشنائی بہت
ہم سمندر کنارے ہی آباد ہیں

ویسے تو نکل آئے بپھرے ہوئے قلزم سے
الجھے تو بہت ہم بھی خوابوں کے طلاطم سے

ہم خاک نشینوں کو برسات سے کیا مطلب
ہم کام چلاتے ہیں بس ایک تیمّم سے

باقی تو تماشہ ہے الجھے ہوئے رشتوں کا
بس خود سے تعلق ہو اور ربط رہے تم سے

ہم تجھ سے ہیں ملنے کو شاداں بھی، ہراساں بھی
دیدار کے شیدائی، ڈرتے ہیں تصادم سے

راس آئی کہاں ہم کو حق گوئی و بیباکی
اپنے بھی تو نالاں ہیں اس طرزِ تکلم سے

ہر سمت فضاؤں میں پرواز ہماری ہے
بیٹھے ہوئے لگتے ہیں، چپ چاپ سے، گم سم سے

سچ تو یہ ہے یہاں پرائے ہیں
ہم فلک سے اتر کے آئے ہیں

کوئی ساحل قریب ہے شائد
کچھ پرندے نظر تو آئے ہیں

فتح کا جشن تو منا نہ سکے
ہار کے سوگ تو منائے ہیں

اب کے شائد نصیب کھل جائیں
اب کے بادل قریب آئے ہیں

جانتے ہیں ہوا کی فطرت کو
پھر بھی ہم نے دیے جلائے ہیں

ان پہ کیوں پھیرتے ہو پانی، کہ یہ
آپ ہی کے کئے کرائے ہیں

یہ علاقہ بڑا ہی موزوں ہے
دھوپ تھوڑی ہے، تھوڑے سائے ہیں

تمہارے بعد ہوئی ختم برکتیں جیسے
خیال و خواب ہوئیں ساری رحمتیں جیسے

درِ حبیبؐ پہ ہر دم ہے خوشبوؤں کا ہجوم
ہوائیں بانٹتی پھرتی ہیں نکہتیں جیسے

ہمارے بعد، سنا، سوگوار ہے دشت
ہمیں پکارتی پھرتی ہیں وحشتیں جیسے

اسے پکارتے رہنا تو میری عادت ہے
وہ دیتا رہتا ہے مجھکو ہدایتیں جیسے

کہیں وہ نور کے دھارے سا ہے ابلتا ہوا
کہیں پہ رنگ، کہیں پر ہے نکہتیں جیسے

میں بھیگ بھیگ گیا راہِ شوق میں کاتبؔ
برس رہی تھیں ہر ایک گام رحمتیں جیسے

تمام شہر ہی محصور کر دیا گیا ہے
امیرِ شہر کو مجبور کر دیا گیا ہے

سنا ہے اب وہاں ظلمت کا بول بالا ہے
سنا ہے چاند کو بے نور کر دیا گیا ہے

وہ ہفت رنگ تجلی ہے چار سو، کہ مجھے
تمھاری دید سے معذور کر دیا گیا ہے

ابھی تو میرے مرض کی تشخیص جاری تھی
جنونِ عشق ہے، مشہور کر دیا گیا ہے

پئے وصال میں شائد ابھی ادھورا تھا
مجھے فراق میں بھرپور کر دیا گیا ہے

دکھائی دیتے ہیں سڑکوں پہ رینگتے افعی
ہماری آنکھوں کو مسحور کر دیا گیا ہے

ریگزاروں کو یونہی وقفِ ستم ہونا تھا
اور دریا کو سمندر ہی میں ضم ہونا تھا

جو نشاں تو نے لگایا تھا، ہمیں، تیری قسم
اس سے بڑھنا بھی نہیں تھا نہ ہی کم ہونا تھا

ہم نے اشعار میں لکھ دی ہے کہانی اپنی
سب کو اصرار تھا، یہ قصہ رقم ہونا تھا

تم بھی دیمک زدہ لکڑی کی طرح ٹوٹ گئے
تم تو فولاد تھے، تم کو تو نہ خم ہونا تھا

موسلا دھار برستے ہوئے رہنا تھا ہمیں
اب کے پتھریلی زمینوں کو بھی نم ہونا تھا

اس سے آگے تو ولایت ہے عصا والوں کی
تیز دھاروں کو بھی اس موڑ پہ خم ہونا تھا

کرنوں کے تعاقب میں افلاک تلک جانا
اور چاند کی وادی میں خوشبو سا بھٹک جانا

جاتے ہو مرے سورج! پھر لوٹ کے آنے تک
روشن سی کوئی ساعت، دیوار پہ رکھ جانا

شاید کوئی دروازہ کھل جائے رہائی کا
ہر روز بلا ناغہ دیوار تلک جانا

ایسے تو قیامت تک منزل نہ ملے تم کو
یہ کیا کہ نکلنا اور دو گام پہ تھک جانا

یہ کارِ سخاوت بھی آنکھوں کا فریضہ ہے
دکھ میں بھی چھلک جانا، سکھ میں بھی چھلک جانا

سو بار پگھلنے کو حاضر ہیں مرے مولاؐ !
افلاک کی چلمن سے اک بار جھلک جانا

اب اس کے سوا کاتب سیکھا ہے کہاں کچھ بھی
کافور سا جل جانا، صندل سا مہک جانا

پاؤں دھرنے کو خاکداں بھی نہیں
سر چھپانے کو آسماں بھی نہیں

ہم ڈرونوں کی زد میں کب سے ہیں
کیا ہمیں جان کی اماں بھی نہیں

ہاں اسی سر زمیں پہ بسنا ہے
لوٹ جانے کو کشتیاں بھی نہیں

اب کے پانی عجیب شکل میں ہے
منجمد بھی نہیں، رواں بھی نہیں

بے نیازی کی کیسی منزل ہے
رنجشِ عمرِ رائیگاں بھی نہیں

ڈھونڈنا ہے تو درمیاں ڈھونڈو
ہم یہاں بھی نہیں وہاں بھی نہیں

پھر بیاباں میں ہے مجبور کوئی
پھر سرِ طور جلے نور کوئی

میری تنہائی میں در آئے کبھی
رنگ اور نور سے معمور کوئی

آؤ نزدیک سے دیکھیں تو ذرا
جھلملاتا ہے بہت دور کوئی

کسی خاکی میں کہاں ایسا جمال
چشمِ بددور! وہ ہے حور کوئی

آؤ سرتاپا مہک جاؤ، یہاں
عود و لوبان ہے، کافور کوئی

آج زنداں میں چراغاں ہوگا
لوٹ کر آیا ہے مفرور کوئی

دیکھ اس قریۂ گمنامی میں
ایک دن آئے گا مشہور کوئی

یا تری شانِ بے نیازی دے
یا ہمیں اذنِ باریابی دے

تیری دریا دلی کے چرچے ہیں
دے ہمیں بھی کوئی نشانی دے

اس کنویں سے نکال لے جائیں
مجھ کو دو چار ایسے بھائی دے

کوئی کشتی ہے یا کوئی ساحل
کچھ ہمیں دور سے دکھائی دے

اک شجر درمیان صحرا کے
سوکھتا جا رہا ہے، پانی دے

آگے بڑھنے کا راستہ پوچھیں
آتا جاتا کوئی دکھائی دے

ڈھونڈ کاتبؔ سا کوئی دیوانہ
تیرے ہونے کی جو گواہی دے

ہم کہاں وادیٔ گلزار میں آئے ہوئے ہیں
ہم تو اک خطۂ پر خار میں آئے ہوئے ہیں

جیت کے جشن میں تھے ہار میں آئے ہوئے ہیں
ہم اچانک کسی یلغار میں آئے ہوئے ہیں

پھر وہی ہم ہیں وہی دھوپ کی وادی کا سفر
اک ذرا سایۂ دیوار میں آئے ہوئے ہیں

شور اتنا کہ سنائی نہیں دیتا کچھ بھی
ایسا لگتا ہے کہ بازار میں آئے ہوئے ہیں

لوٹ جانا بھی ہے دشوار، رہائش بھی کٹھن
ہم کسی ساعتِ تکرار میں آئے ہوئے ہیں

ہم بھی بغداد کی مانند نہ لٹ جائیں کہیں
جیسے ہم نرغۂ تاتار میں آئے ہوئے ہیں

بعد مدت یہ سنا ہے کہ چراغاں ہوگا
کچھ جواں کوچۂ دلدار میں آئے ہوئے ہیں

ڈھونڈتا کیا ہے تو کسیلے میں
شہد ہوتا تو ہے رسیلے میں

کوئی للکار کا جواب تو دے
کوئی شہ زور ہے قبیلے میں؟

بس جلاتے ہی وہ ہوا مائل
جانے لکھا تھا کیا فتیلے میں

تیری دہلیز تک تو آتا ہے
ہوش اتنا تو ہے نشیلے میں

سب رنگے جا رہے ہیں اسکے رنگ
کوئی تو بات ہے رنگیلے میں

ڈھونڈتے ہو کہاں کہاں کاتبؔ
وہ حوالے میں اور حیلے میں

روز و شب مجھ میں سماتا ہے کوئی
نت نئے جلوے دکھاتا ہے کوئی

چین سے کب مجھے سونا ہے نصیب
وقت بے وقت بلاتا ہے کوئی

بند ہے سلسلۂ آمد و رفت
کوئی آتا ہے نہ جاتا ہے کوئی

بارہا مجھ کو جلانے کے لئے
بارہا مجھ کو بجھاتا ہے کوئی

جاتے جاتے تو رلاتے ہیں سبھی
آتے آتے بھی رلاتا ہے کوئی

داخلے کے سبھی در بند ہوئے
یوں بھلا دیر سے آتا ہے کوئی

رات آنکھوں نے خزانہ جو لٹایا ہوگا
صبح خورشید نے آکر وہ سمیٹا ہوگا

تم کو لگتا ہے کہ تم نے مجھے دیکھا ہے کہیں
چاند کے ساتھ پگھلتے ہوئے دیکھا ہوگا

پھر انھیں بھول بھلیوں میں چلو ڈھونڈتے ہیں
آگے بڑھنے کا وہیں پر کوئی رستہ ہوگا

میرے دامن سے لپٹتی ہوئی وحشت ہوگی
میرے قدموں میں سمٹتا ہوا دریا ہوگا

کوئی آہٹ، کوئی دستک سی سنائی دی ہے
مجھ سے ملنے کوئی دروازے پہ آیا ہوگا

اس نے پوچھا بھی نہیں دیر سے آنے کا سبب
میری مجبوریاں وہ خوب سمجھتا ہوگا

اسی امید پہ بس رات گزاری ہم نے
ابھی آتا ہے وہ شاید ابھی آتا ہوگا

محمد حنیف کاتب نے روایت اور جدت کا بہترین امتزاج اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔اس طرح کا خیال بلکہ اس طرح کے دعوے بہت سے نقادووں نے مختلف شعراء کے مجموعوں پر مقدمے لکھتے ہوئے پیش کیئے ہیں مگرانھوں نے جدت کی شدت بلکہ اس کی حدت کا ذکر کرتے ہوئے پامال موضوعات ہی کا سہارا لیا ہے۔میری رائے میں کاتب موصوف کے یہاں جس قسم کی جدت طرازی پائی جاتی ہے اس میں احساس کی نرم اور دھیمی آنچ کے عمق میں جن تجربات کے ایندھن کی کارفرمائی ہے اسمیں فنکارانہ شائستگی اور شاعرانہ پختگی کا عمل دخل صاف محسوس ہوتا ہے۔ان کی شاعری کی اس خصوصیت کا ادراک اس وقت دوبالا ہوتا ہے جبکہ اس کی خواندگی یکبارگی نہ ہو بلکہ شعر کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا جائے۔

راہی فدائی

LARZISH-E-LAB

by

Mohamed Haneef Katib

محمد حنیف کاتب میرے قیمتی دوستوں میں سے ہیں جن سے میری ملاقات کویت میں ہوئی اور ہماری شناسائی ان کی شعری حسیت کے تناظر میں مضبوط تر ہوتی گئی۔ وہ ایک ایسے شاعر ہیں جس کے کلام میں ہم عصر سوچ بھی ہے، علامتی اظہار بھی، ملت کا درد بھی ہے اور علومِ دینی و دنیاوی کا عرفان بھی، اس لئے ان کے شعر سراسر ذاتی تجربات کے پس منظر میں گہری معنی خیز بلکہ عمیق فلسفیانہ فکر کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری بیشتر واحد متکلم لب ولہجہ میں اظہار کا وسیلہ بن کر ابھرتی ہے۔ ان کی زبان شستہ اور مستعمل لفظیات نئے پن کے سبب متوجہ کر لیتے ہیں۔

محمد حنیف کاتب زبان برتنے میں بے حد احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ بحور اور اوزان کے تجربوں کا شوق بھی ہے لیکن ہمیشہ مناسبت، معیار اور مقیاس کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ زبان معرب بھی ہے اور مفرس بھی اور پھر اسمیں ہندی کا رس بھی ہے۔ تراکیب، تشبیہات، علامات اور مصطلحات کا استعمال بے حد توازن سے کرتے ہوئے جدت کا زاویہ بھی خوب ملحوظ رکھا ہے۔ اس لئے ان کا کلام جدید تر شاعری کا آئینہ دار بن گیا ہے اور اس کے لئے شاعر کی کامیابی باعثِ تحسین ہے۔

الفاظ کے اندر پوشیدہ جو صوتی، فکری اور معنوی قوتیں ہوتی ہیں ان کا ادراک ایک خلاق ادیب و شاعر کو اس کی عبقریت اور مہارت کے سبب بدرجہا بڑھکر ہوتا ہے ایک عام قلم کار کے مقابل! اور شاعر تو افکار اور الفاظ میں اپنی فنکاری سے جان ڈال دیتا ہے۔ محمد حنیف کاتب کی شاعری کو پڑھتے ہوئے بار بار یہ احساس چونکا دینے کی حد تک ہوتا ہے کہ ان کی غزلیات میں تازہ کاری بھی ہے، ندرت بھی ہے اور کچھ کہنے کی کسک بھی اور یہی ان کی شاعری کی قبولیت کا جواز ہے۔ لب ولہجہ منفرد، ڈکشن جداگانہ اور تجربات اظہارِ ذات سے معنون!!

محمد حنیف کاتب اردو شاعری کی بساط پر ایک نیا اور معتبر نام ہیں اور میں ان کے اس مجموعۂ کلام کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ اہلِ نظر ضرور اس کی پذیرائی کریں گے۔

اسلم عمادی، کویت

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

978-93-86486-52-3